
کرشن چندر
تاش کا کھیل

تاش کا کھیل

نئے اور منتخب افسانے

تاش کا کھیل

(افسانے)

کرشن چندر

رفعت پبلشرز

۴۳- شاہراہ قائد اعظم لاہور

مصنّف کی دیگر کتب

کاک ٹیل۔

دشت خیال۔

دُوسری برفباری سے پہلے۔

تاش کا کھیل

(افسانے)

کرشن چندر

رفعت پبلشرز

۳۴۔ شاہراہ قائد اعظم لاہور

ناشر: ریاض ملک ۔ مالک رفعت پبلشرز
طابع: نذیر حسین ندرت پرنٹرز لاہور
قیمت: ۱۲ روپے
بار: اوّل ۱۹۷۸ء
تعداد: ایک ھزار

انتساب!

"—— زندگی کی بازی بھی ایک طرح سے "تاش کا کھیل"
ہے۔ اس میں کبھی ہار ہے، کبھی جیت۔ کبھی پتے اچھے آتے
ہیں، کبھی بُرے آتے ہیں۔ کبھی پارٹنر سے جھگڑا ہوتا ہے۔
صلح صفائی بھی ہوتی ہے۔ حساب کتاب بھی ہوتا ہے اس طرح
اپنے پتے کھیلتے کھیلتے ہم بھول جاتے ہیں کہ اِن پتّوں سے
باہر بھی کوئی دنیا ہے ——"

کرشن چندر

ترتیب :-

کرشن چندر کی محبوبہ

خواجہ احمد عباس

ایک تھا کرشن چندر۔

ایک تھی کرشن چندر کی محبوبہ۔

سات آٹھ برس کی عمر تھی جب اس نے پہلی بار اپنی محبوبہ کو دیکھا، اور دیکھتے ہی دل دے بیٹھا۔ دراصل وہ کرشن چندر کی ہی عمر کی تھی، اگرچہ دیکھنے میں اس سے بڑی لگتی تھی۔

اس کی محبوبہ حسین تو تھی ہی، طرحدار بھی تھی، تیز و طرار بھی۔ نوعمری میں ہرن کی طرح کلیلیں بھرتی تھی۔ اگرچہ اس لیلیٰ کے پیچھے سینکڑوں، بلکہ ہزاروں مجنوں دیوانے تھے۔ لیکن کوئی اُس کے پاؤں کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا تھا... مگر کرشن چندر کے تیز قدموں نے جلد ہی اپنی محبوبہ کو جا لیا اور بولا — "تم مجھ سے دُور نہیں بھاگ سکتیں ہیں

شربتی آنکھوں والا کرشن چندر ہوں!"

وہ بولی —— "میں شربتی آنکھوں والے کرشن چندر سے زیادہ خوبصورت ہوں، کیونکہ میں کرشن چندر کی محبوبہ ہوں۔"

وہ بولا —— "پھر اب کیا کریں؟"

وہ بولی —— "آؤ، کوئی کھیل کھیلیں!"

اس نے پوچھا —— "کون سا کھیل!"

وہ بولی —— "گڈے گڑیا کی شادی کا کھیل!"

سو کرشن چندر لایا اپنا گڈا، اور اس کی محبوبہ لائی اپنی گڑیا۔ دونوں نے مل کر شادی رچائی۔ گڈا سہرا باندھ کر گھوڑے پر چڑھا، گڑیا لال جوڑا پہنے، یہ لمبا گھونگھٹ نکالے ڈولی میں بیٹھی۔ نقلی داڑھی لگائے قاضی صاحب ان کا نکاح پڑھانے آئے۔ مگر ابھی قاضی صاحب "پتے پہ پتہ۔ پتے پہ دہی۔ گڈے گڑیا کا نکاح سہی" پورا نہ کہنے پائے تھے کہ کرشن چندر کے ماں باپ نے بیٹے کو لگن منڈپ سے اٹھا لیا۔ کرشن چندر "ہائے میری محبوبہ، ہائے میری محبوبہ!" چلاتا ہی رہا۔ مگر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسکول میں ڈال دیا گیا۔

مگر جس کو عشق کا چسکا ایک بار پڑا ہو، وہ اسکول کالج کی دیواروں اور کتابوں کی جلدوں میں قید تھوڑا ہی رکھا جا سکتا ہے۔ کہتے ہیں مجنوں کو ہر طرف لیلیٰ کا ہی جلوہ نظر آتا تھا۔ کرشن چندر بھی مجنوں سے کم تھوڑا ہی تھا۔ اس کو تختی پر لکھی ہوئی "ا..... ب..... پ ....." میں، سلیٹ پر لکھے ہوئے جمع تفریق کے سوال، بلیک بورڈ پر چاک سے بنے ہوئے ریاست کشمیر کے نقشے میں، غرض ہر چیز میں، اُسے اپنی محبوبہ کا جلوہ نظر آتا، اور وہ اس

میں محو اور مگن رہتا۔ مگر اس کے عشق کا جذبہ صادق تھا، اس لیئے اس کی پڑھائی میں حارج نہ ہوتا۔ جب بھی وہ "اے میری محبوبہ" کہہ کر سبق یاد کرتا تو اس کو زبانی یاد ہو جاتا۔ جمع تفریق کے سوالوں میں تو اسے خاص دل دلچسپی تھی اور اس لئے خاص مہارت حاصل ہو گئی تھی۔ مگر وہ ایک نئے حساب کی بات سوچتا، ایک میں ہوں ایک میری محبوبہ ہے، اگر ان کو جمع کر دیا جائے تو جواب "دو" نہیں ہوگا بلکہ "ایک" ہی ہوگا۔ کیونکہ دو تو ہوتے ہیں ریاضی کے قاعدے کے مطابق، لیکن یہ عشق کا حساب کتاب ہے۔ اس میں "ایک جمع ایک" ایک ہی ہوتا ہے۔

اسکول سے کالج میں پہنچا تو اس کی جوانی کے ساتھ ساتھ اس کا عشق بھی پروان چڑھا۔ اب تو وہ سوتے جاگتے اپنی محبوبہ کا جلوہ دیکھتا۔ کبھی ڈکشنری کے الفاظ میں، کبھی تاریخ کی کتاب میں، کبھی اکنامکس کے قوانین میں، کبھی پولیٹیکل سائنس کے اصولوں میں۔ ادب اور شاعری تو وہ غذا تھی جس پر اس کا عشق پل رہا تھا، بڑھ رہا تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ کرشن چندر کا مزاج تو "لڑکپن سے عاشقانہ تھا"۔ اب اس کی عادتیں بھی عاشقانہ ہو گئیں۔ رفتہ رفتہ عادی مجرم کی طرح وہ پیشہ ور عاشق مشہور ہو گیا۔ عشق ہی اس کا اوڑھنا بچھونا، میز اور کرسی، کاپی اور کتاب، قلم اور دوات ہو گیا۔

وہ اپنی محبوبہ کو ہمیشہ نیلے، چکنے، دبیز اور عطر میں ڈوبے ہوئے کاغذ پر خط لکھتا تھا۔ اب ان خطوں نے اس کو اور اس کے عشق کو ہندوستان ہی میں نہیں ساری دنیا میں بدنام کر دیا۔

کرشن چندر کی محبوبہ بلا کی جامہ زیب تھی۔ نہ جانے کس دیس کی رہنے والی تھی۔ نہ جانے کون سی مٹی سے اس کے سڈول اور نازک بدن کو بنایا گیا تھا کہ اس پر ہر لباس

پھبنا تھا۔

کرشن چندر کا بچپن اور نوجوانی کا زمانہ کشمیر میں گزرا تھا۔ سو پہلے تو کرشن چندر نے اس کو کشمیری "فرن" پہنایا۔ اس کے خوبصورت چہرے اور بدن کی تصویر کھینچنے کے لئے اس کے پس منظر میں بجائے فوٹو گرافروں والے نقلی پردے کے اس نے کشمیر کا تمام قدرتی حُسن سمیٹ کر رکھ دیا۔ برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں، سرسبز و سرمئی گھاٹیاں، شفاف پانی کے جھرنے، تیز مزاج پہاڑی ندیاں اور شانت ٹھہرے ہوئے پانی کی جھیلیں، جن پر تیرتے ہوئے کنول کے پھول ایسے لگتے تھے جیسے کالے آسمان پر ستارے جھلملا رہے ہوں۔ اس نے سوچا، اس حسین اور رنگین پس منظر میں میری محبوبہ کے حُسن پر اور نکھار آ جائیگا۔ اب میں اس کا نام زعفرانی رکھوں گا۔ کیونکہ وہ زعفران کے پھولوں کی طرح نازک اور رنگین اور مہکتی ہوئی ہے۔

مگر جب وہ اُس حسین پس منظر کے سامنے آ کھڑی ہوئی، تو کرشن چندر نے دیکھا۔ کہ اس کی محبوبہ کا فرن از حد میلا ہے اور پھٹا ہوا ہے، اُس کے پریشان بالوں میں دھول اَٹی ہوئی ہے، اس کے بدن پر کوڑوں کی مار کے گھاؤ ہیں۔ مگر اس کی آنکھوں میں وہی پرانی محبت جگمگا رہی ہے۔ کرشن چندر نے اپنی محبوبہ سے پوچھا—

"میں نے تو تجھے نیا فرن بنوا کر دیا تھا، کہاں پھٹا؟"

محبوبہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولی— "تم نے نیا فرن ضرور بنوا کر دیا تھا، لیکن یہ بھول گئے ہو کہ اُس کو آج تین برس ہو گئے ہیں۔"

پھر کرشن چندر نے سوال کیا— "تیرے کالے چکنے خوبصورت بالوں میں تو میں نے ڈل جھیل سے توڑ کر ایک کنول کا پھول لگایا تھا، اس کے بجائے یہ دھول مٹی کہاں سے

آ گئی ؟"

کرشن چندر کی محبوبہ نے سر اُونچا کر کے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا ـــــ "یہ دھول محنت کی ہے، جنگل سے لکڑیاں توڑ کر، سر پہ اُٹھا کر بازار میں بیچ کر آئی ہوں۔ یہ دیکھو چار آنے ملے ہیں۔"

کرشن چندر نے سوال کیا ـــ "مگر یہ گھاؤ کیسے ہیں ؟ کس ظالم نے اس پھول سے بدن پر کوڑے برسائے اور کیوں ؟"

محبوبہ نظریں جھکا کر بولی ـــ "کیوں ؟ اس لئے کہ میں محنت کرتی ہوں، لکڑیاں بیچتی ہوں، اپنی عزت نہیں بیچتی۔ دراصل مار اس لئے پڑی ہے۔ مگر کہنے کو لکڑی چرائی تھی، اس لئے ہنٹر مار مار کر سزا دی گئی ہے۔"

کرشن چندر کو غصہ آگیا ـــ "بتا اس ظالم کا نام ! میں اس کا سر توڑ ڈالوں گا۔"

محبوبہ ایک غم ناک مسکراہٹ کے بعد بولی ـــ "کس کس کا سر توڑو گے ؟ ایک زمیندار ہے جس کا جنگل ہے، ایک ٹھیکیدار ہے جس کی لکڑی ہے، ایک سرمایہ دار ہے جو لکڑی خریدتا ہے۔ ایک راجہ ہے، اس کے کارندے، افسر ہیں، پولیس والے ہیں، جو سب زمیندار کے جنگل کی، ٹھیکیدار کے ٹھیکے کی، سرمایہ دار کے دکان کی حفاظت کرتے ہیں، اور غریب لڑکی کی عزت کی حفاظت کوئی نہیں کرتا ـــ تم کس کس سے لڑو گے ؟"

کرشن چندر نے دانت ہنس کر جواب دیا ـــ "ایک ایک سے لڑوں گا" ـــ اس نے میز پر سے اپنے قلم کو اس طرح اٹھایا جیسے کوئی اعلان جنگ کے لئے ننگی تلوار کو بلند کرتا ہے۔ پھر وہ بولا ـــ "تم میرے ساتھ رہو گی، تم میرا ساتھ دو گی، تو میں ہر ظلم کا مقابلہ کر سکتا ہوں۔ آج سے تم ہی میری شریک حیات ہو، تم ہی میرا سرمایہ ہو۔ تم ہی میرا

ہتھیار ہو۔"

پھر کرشن چندر اپنی محبوبہ کو ساتھ لے کر کشمیر کی ریاست کے گھٹے ہوئے ماحول سے لاہور آ گیا۔ لیکن کشمیر کی حسین اور مغموم وادیوں میں اُس کے اعلانِ جنگ کی آواز مدتوں تک گونجتی رہی اور مظلوموں کو بغاوت پر آمادہ کرتی رہی۔

کرشن چندر کی محبوبہ نہ صرف حسین تھی بلکہ بڑی چلبلی بھی تھی۔ ایک پل کے لئے اُس کو قرار نہیں تھا۔ ابھی "بالکنی" میں کھڑی دنیا کے نشیب و فراز کا معائنہ کر رہی ہے تو ابھی "زندگی کے موڑ پر" سے اُس سڑک کو تک رہی ہے جو اَبد سے اَزل تک جاتی ہے۔ کبھی "مٹی کے صنم" تراشتی، کہ وہ اُسے مندر میں رکھی ہوئی پتھر کی مُورتیوں سے زیادہ پوتر اور پرستش کے قابل لگتے، تو کبھی "مکڑی" کے جالے بناتی، پھر اُن جالوں کو توڑتی، کیونکہ سماج کے بندھن بھی اُسے اتنے ہی بے حقیقت نظر آتے جتنے کہ "مکڑی" کے جالے! مذہب اور ذات پات کے ڈھکوسلوں سے وہ بھی کرشن چندر کی طرح آزاد تھی۔ کبھی "کالو بھنگی" کے ہاتھ سے کھانا کھا لیتی، تو کبھی "بھگت رام" کی بھگت بن جاتی —— بھگت رام، جس نے مسلمان فقیرنی سے شادی کی تھی اور جو سانپ اور نیولے پالتا تھا، اس لئے کہ اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ کالے ناگ کا زہر اتنا خطرناک نہیں ہے جتنا اُن انسانوں کا جو زچگی میں اس کی بیوی کی موت کے ذمے دار تھے! —— اس کے دل میں کوئی قومی تعصب بھی نہیں تھا، اور وہ "موبی" جیسے امریکن فوجی سے بھی دوستی کر سکتی تھی، اور جب موبی کو ٹخنے پر سانپ نے کاٹا اور کوئی دوسری ترکیب اس کی جان بچانے کی نہ سوجھی تو کرشن نے اپنی محبوبہ کو دیکھا کہ وہ اپنے ہونٹوں سے زہر چوس رہی ہے، اور اس کو ایسا محسوس ہوا، گویا "یہ زہر موبی کے جسم سے نہیں بلکہ اس کی روح سے چوس کر باہر نکال دیا گیا ہے۔

وہ زہر جو کالے کو گورے سے، غریب کو امیر سے، اور آدمی کو آدمی سے جدا رکھتا ہے!
—— اور اس کے بعد کچھ دنوں کے لئے اس کی محبوبہ وہاں سے غائب ہو گئی۔ لوگ سمجھے شاید "موبی" کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔

اپنی محبوبہ کو تلاش کرنے کے لئے کرشن چندر سارے ہندوستان میں مارا مارا پھرا۔ بنگال کے ایک گاؤں میں گھوم رہا تھا، کہ ایک بنگالن حسینہ دکھائی پڑی۔ وہ اسوقت پانی میں تیر رہی تھی جب وہ ساحل کی ریت پر ٹہل رہا تھا..... لانبے ریشمی گھنے بال اور جل پری جیسا چہرہ..... لیکن جب کرشن چندر اس کے قریب گیا، تو اس نے دیکھا کہ یہ تو وہی اس کی محبوبہ ہے جو کشمیری "فرن" کی بجائے اب لال کنارے والی بنگالی ساڑھی لپیٹے ہوئے ہے۔ کرشن چندر نے کہا——

"یہاں کہاں چھپی ہوئی ہو، آؤ، میں کب سے تمہاری محبت کا بھوکا ہوں۔"

وہ بولی —— "تم تو صرف محبت کے بھوکے ہو، یہاں ہم سب بھات کیلئے بھوکے ہیں، اَن داتا ہم سے روٹھ گئے ہیں۔"

تب کرشن چندر کو معلوم ہوا کہ بھات روپے کا ایک پاؤ ہو جائے تو سمجھو، محبت، ماتما، دوستی، رشتے داری، عزت، آبرو سب ختم ہو گئی ہے۔

اس نے اپنی محبوبہ کو مہاکال کے ماحول سے دور لے جانے کے لئے کہا —— "چلو، کلکتہ چلو!"

جیسے اس کی یہ صدا سارے گاؤں والوں نے سُن لی۔ وہ جانتا تھا کہ گاؤں کی سماجی زندگی ایک بند کی طرح مضبوط ہوتی ہے۔ یکایک "چلو، کلکتے چلو" کی صدا نے اُس بند کا ایک کنارہ توڑ دیا، اور سارا گاؤں اس سوراخ کے راستے بہہ نکلا —— "چلو، کلکتے چلو"——

ہر لب پر یہی صدا تھی۔ اور کرشن چندر نے دیکھا کہ اس کی محبوبہ ہی نہیں، سینکڑوں ہزاروں آدمی اس سڑک پر چل رہے تھے۔ وہ سڑک جو کلکتے کے مضافات میں بنگال کے دور دور پھیلے ہوئے گاؤں میں سے گھومتی ہوئی آرہی تھی...... چلو، کلکتے چلو!..... چیونٹیاں رینگ رہی تھیں۔ اور اس کی محبوبہ بھی ان چیونٹیوں میں سے ایک چیونٹی تھی جو کلکتے کی لاش کی طرف جا رہی تھیں۔ یہ انسانی چیونٹیاں اپنے بوجھل قدموں سے سڑک پر چل رہی تھیں، لڑ رہی تھیں، کراہ رہی تھیں، مر رہی تھیں، اور سو اس کی محبوبہ نے بھی اس سڑک پر دم توڑ دیا۔ اور یہ دیکھ کر کرشن چندر رویا نہیں، اس نے آہ د بکا نہیں کی۔ اسکی آنکھوں میں آنسو کا ایک قطرہ نہیں چھلکا...... لیکن اس کی آواز میں ایک نئی تلخی ایک نئی طاقت تھی اور وہ کہے جا رہا تھا ـــــ

"جب تک دنیا میں ایک شخص بھی بھوکا ہے یہ دنیا بھوکی رہے گی، جب تک دنیا میں ایک آدمی بھی غلام ہے سب غلام رہیں گے، جب تک دنیا میں ایک آدمی بھی مفلس ہے سب مفلس رہیں گے!" ـــــ اور پھر آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر شکوہ کیا ـــــ "اَن داتا! تیری دنیا میں مَیں محکوم و مجبور!"

مگر دراصل کرشن چندر کی محبوبہ مری نہ تھی، صرف بھوک اور کمزوری سے بے ہوش ہو گئی تھی۔ کرشن چندر نے اپنی محبت کے آبِ حیات سے اس کے مردہ جسم میں جان ڈالی، بے ہوشی سے ہوش میں لایا۔ کمزوری دور کرنے کے لئے ہر قسم کے جتن کئے۔

محبوبہ نے کہا ـــ "مجھے سیب پسند ہیں" ـــــ تو کلو اور کشمیر کے سیب کھلائے! آلوچوں کی فرمائش کی، تو پہلگام کے "آلوچے" کھلائے۔

"لوکی" کا عرق نکال کر دیا، کہ اس میں وٹامن ہوتے ہیں۔

"ایرانی پلاؤ" کھلایا۔ جس میں سعدیؒ شیراز کے وطن کی مہک تھی۔

اور جب اس کی محبوبہ کے گال کشمیر کے سیبوں کی طرح لال ہو گئے۔ جب اسکے ہونٹوں میں ایک بار پھر آلوچوں کا رس بھر گیا، اور اس کی آنکھوں میں "محبت کا پھول" پھر کھل اٹھا ــــ تو کرشن چندر نے اُسے "بمبئی لاکر" "مہالکشمی کے پُل" پہ کھڑا کر دیا۔ جہاں چند مختلف رنگ کی ساڑھیاں، جو سُوکھنے کے لئے پھیلا دی گئی تھیں۔ ایک انقلابی پرچم کی طرح لہرا رہی تھیں۔ اور اس نے محبوبہ سے کہا ــــ "ان ساڑھیوں میں سے کوئی۔ کسی رنگ کی ساڑھی پسند کر لو"

ــــ اور کیونکہ وہ معمولی لڑکی نہیں تھی، کرشن چندر کی محبوبہ تھی، اس نے وہ ساڑھی پسند کی جس پر پڑے ہوئے انسانی خون کے دھبے ظلم کے خلاف خاموش فریاد کر رہے تھے اور جس میں بندوق کی گولیوں کے سوراخ کسی کی پتھرائی ہوئی آنکھوں کی طرح جھانک رہے تھے۔

وقت گزرتا گیا ــــ

اور اُس مہالکشمی کے پل کے نیچے سے "پشاور ایکسپریس" بھی گذر گئی۔ پشاور ایکسپریس جو ہندوستان اور پاکستان کی نئی بنی ہوئی سرحدوں کو پار کر کے آئی تھی، اور جس کے تیز رفتار پہیے ہندو اور مسلمان اور سکھ کے خون سے لتھڑے ہوئے تھے اور ایک فولادی آہنگ کے ساتھ اعلان کر رہے تھے ــــ "ہم وحشی ہیں"۔ "ہم وحشی ہیں"۔ "ہم وحشی ہیں"

اور جب یہ سب دیکھ کر اس کی محبوبہ مایوسی کے اندھیرے میں کھو گئی، تو کرشن چندر نے اس سے کہا ــــ مایوس مت ہو میری جان، دیکھ زنداں سے پرے، رنگ چمن جوش بہار جدھر ایک نیا گلستان کھلا ہوا ہے۔ دیکھ، کہ تیری آنکھوں میں تازگی اور تراوٹ آ جائے گی۔ اس لئے کہ وہاں پھول سُرخ ہیں!

"جب کھیت جاگے"، تو کرشن چندر کی محبوبہ بھی جاگ پڑی۔ وہ نہ صرف خود جاگی،

بلکہ جہاں تک اس کی آواز پہنچتی تھی اُس نے ہر ایک کو بیدار کیا۔ مردوں کو، عورتوں کو، جوانوں کو، بچوں کو، کسانوں کو، مزدوروں کو، کلرکوں کو، طالب علموں کو۔ اور پھر تو وہ وقت آیا، کہ تخلیق کے جادو سے پتھروں میں بھی جان پڑ گئی، اور وہ چلا پڑی "بت جاگتے ہیں" اور تم سوتے ہو؟

اور پھر کرشن چندر دنیا کے سفر پر گیا۔ اور جہاں بھی وہ گیا اُس کی محبوبہ اُس کے ساتھ گئی۔ اب تو ہر ملک میں اُس کے چرچے ہونے لگے۔ روس میں چیکوسلواکیہ میں، ایران اور مصر اور دوسرے عرب ملکوں میں، چین میں جاپان میں، انگلستان میں، امریکہ میں جہاں جہاں بھی وہ گئی، وہاں نہ صرف اُس نے اپنے حُسن کی چاندنی بکھیری، بلکہ وہاں سے اس نے نئے سنگھار، نئے اندازِ معشوقانہ سیکھے اور اختیار کئے۔

"لندن کے سات رنگ" میں وہ رنگی گئی: "ہانگ کانگ کی حسینہ" کہلائی۔ لیکن اُس کے ہزاروں چاہنے والوں کو شکایت تھی کہ اب اس کے بدن میں سے "بارود اور چیری کے پھول" کی انقلابی خوشبو کی مہک نہیں آتی جو وہ کبھی کوریا کے مجاہدوں سے لائی تھی۔

وقت گزرتا گیا ـــــ

جوں جوں کرشن چندر کی عمر زیادہ ہوتی گئی، اُس کی محبوبہ جوان ہوتی گئی، حسین سے حسین تر ہوتی گئی۔ اس کے چاہنے والوں کی تعداد ہزاروں سے لاکھوں تک پہنچ گئی۔

مگر کرشن چندر ان عاشقوں میں سے نہیں تھا جو محبوبہ کو اپنی ذاتی جائداد سمجھتے ہیں۔ جو کوئی اس کی محبوبہ کو چاہتا تھا وہ کرشن چندر کو عزیز تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ جو لوگ خوش مذاق ہیں، حُسن شناس ہیں، وہی تو میری محبوبہ سے محبت کر سکتے ہیں۔

لوگ تعجب کرتے تھے کہ کرشن چندر کی محبوبہ اس عمر میں بھی اتنی حسین اور نوجوان

کیوں نظر آتی ہے ؟ اُس کے گالوں کی یہ لالی، یہ غازے اور سُرخی کی مرہونِ منت نہیں ہے۔ یہ کہاں سے آتی ہے ؟ اُس کی آنکھوں میں یہ چمک کہاں سے آئی ہے ؟ اس کے ہونٹ لپ سٹک کے بغیر سُرخ عنابی کیوں رہتے ہیں ؟ لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ کرشن چندر کی محبوبہ ایک معصوم ڈائن ہے جو رات کے سناٹے میں کرشن چندر کا خونِ دل پیتی ہے یہی وہ آبِ حیات ہے جس نے کرشن چندر کی محبوبہ کو جوانی اور توانائی اور دلکشی بخشی، اور خود کرشن چندر کے دل کو کھوکھلا کر کے اُس کو موت کے دروازے پر لا کھڑا کیا۔

کرشن چندر کو دل کا دورہ پڑا، اور اس کے قریبی دوست، عزیز اور رشتے دار، جو اب بھیانک راز سے واقف ہو گئے تھے۔ کرشن چندر کی محبوبہ کو کوسنے لگے۔ آگ لگے اس کلموہی کو۔ کیڑے لگیں اس جوانی اور حسن کو، جو ایک انسان کا خون چوس کر اپنے چہرے پر نکھار لاتے ہیں۔ اُن دنوں کرشن چندر موت اور زندگی کے درمیان ڈول رہا تھا، اس کو ہلنے جُلنے کی ہی نہیں، بولنے بات کرنے کی بھی اجازت نہیں تھی، مگر اس نے اپنی آنکھوں کے اشارے سے کہا ــــ

"مت کوسو، میری محبوبہ کو مت کوسو۔ میرا اور میری محبوبہ کا نازک مگر اٹوٹ رشتہ ہے جسے تم نہیں سمجھ سکتے، میں ہی سمجھ سکتا ہوں۔ اگر وہ میرا خونِ دل پیتی ہے تو اُسے حق ہے، کیونکہ وہ میری دلدار ہے۔ لوگ اپنی محبوبہ کو "میری جان" کہتے ہیں، یہ تو عاشقی کا ایک محاورہ ہے۔ لیکن میری محبوبہ تو واقعی میری جان ہے، میری جان اور میرا ایمان ہے۔ وہ نہ صرف میری زندگی ہے بلکہ زندگی کا ماحصل ہے۔ اگر وہ میرا خونِ دل پیتی ہے، تو مجھے زندگی دیتی بھی ہے۔ ہر سانس جو میں لیتا ہوں، وہ میری محبوبہ کی دین ہے۔ اگر اس کا سہارا نہ ہوتا تو آج میں زندہ نہ ہوتا، تیس برس پہلے یرقان سے مر گیا ہوتا، دس برس پہلے شراب

پی پی کر جان دے دی ہوتی، پانچ برس پہلے گردے کی خرابی سے میری موت ہو جاتی۔ اگر اس بار بھی بچوں گا، تو اسی لئے کہ میری محبوبہ میرے ڈوبتے ہوئے دل کو سہارا دے گی، میرے اُکھڑے سانس کو سنبھال لے گی۔"

اور پھر کرشن چندر نے آنکھوں کے اشارے ہی سے اپنی محبوبہ سے کہا۔۔۔" میری جان۔ ان لوگوں کی باتوں کا بُرا مت مانو، آؤ میرے قریب آؤ!"

اور ہم نے یہ چمتکار دیکھا کہ خطرناک بیماری کی حالت میں بھی کرشن چندر اپنی محبوبہ کی دلداری کر رہا ہے۔ اپنی جان پر کھیل کر اس کے ناز اور نخرے اُٹھا رہا ہے۔ اور بجائے حالت بگڑنے کے روز بروز اس کے چہرے پر رونق آتی جا رہی ہے، دل کی دھڑکن کا توازن درست ہوتا جا رہا ہے۔ ایسا لگتا تھا، کسی مسیحا نے اپنے دستِ شفا سے اُسے چھو دیا ہے۔ ساوتری یم راج کے چنگل سے اپنے ستیا وان کو چھڑا لائی تھی۔ اور کرشن چندر کی محبوبہ نے موت کے چھکے چھڑا دیئے۔

کرشن چندر اچھا ہو گیا۔ اُس کے دوستوں نے اُس کے جامِ صحت پیئے، ڈاکٹروں کو مبارک دی گئی، ان کا شکریہ ادا کیا گیا۔ اور اُس کی محبوبہ پس منظر میں کھڑی مسکراتی رہی، کیونکہ اُس نے کرشن چندر کو زندگی کا تحفہ یُوں ہی نہ دیا تھا، اس میں اس کی اپنی غرض شامل تھی۔ اُس کو تو پھر کرشن چندر کے خونِ دل سے اپنے حُسن پر نکھار لانا تھا۔

اب کہ وہ موت کے گھر سے لوٹ آیا تھا، تو اُس کے ملک والوں کو اُن کی حکومت کو کرشن چندر اور کرشن چندر کی محبوبہ کی قدر ہوئی۔ بمبئی سے لے کر دہلی تک، لندن سے لے کر پراگ اور ماسکو اور تاشقند تک۔ اُن دونوں کی بڑی خاطر مدارت ہوئی۔ اُن دونوں کے جشن منائے گئے۔ راشٹرپتی نے مسکرا کر پدم بھوشن کا تمغہ کرشن چندر کے

گلے میں ڈال دیا۔

کرشن چندر نے وہ تمغہ اپنی محبوبہ کو پہنا دیا۔

محبوبہ نے پوچھا — "یہ غلامی کا طوق تو نہیں ہے ؟"

کرشن چندر نے جواب دیا — "اے میری شریک حیات ! مجھے تو عالم وقت لوہے کی بیڑیاں بھی پہنا سکتے ہیں، سونے کی زنجیریں بھی میرے گلے میں ڈال سکتے ہیں" چاندی کا گھاؤ" بھی لگانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ لیکن دنیا کی تمام دولت بھی تمہاری آزاد آتما کو نہیں خرید سکتی، نہ دنیا کی کوئی طاقت تمہیں قید کر سکتی ہے !"

کرشن چندر کی محبوبہ نے کہا — "تو وعدہ کرو کہ کبھی مجھے دغا نہ دو گے۔ کبھی مجھ سے بے وفائی نہ کرو گے۔"

کرشن چندر نے کہا — "میری جان ! وعدہ کرتا ہوں۔"

کرشن چندر کی محبوبہ نے کہا — "میری قسم کھاؤ !"

کرشن نے کہا — "میں تمہاری قسم کھاتا ہوں !"

کرشن چندر کی محبوبہ نے کہا — "یاد رکھنا ہزار گواہوں کے سامنے عہد و پیماں کیا ہے۔ اب ہمیشہ کے لئے تم میرے ہو، اور میں تمہاری !"

کرشن چندر نے کہا — "اس کا مطلب ہے ہماری شادی ہو گئی !

کرشن چندر کی محبوبہ نے کہا — "ہاں" وہی شادی جو آج سے بہت پہلے ہو جاتی اگر ....."

کرشن چندر نے اپنے بچپن کو یاد کرتے ہوئے کہا — "پتے پہ پتہ، پتے پہ دہی ....."

کرشن چندر کی محبوبہ نے کہا — "مگر نقلی داڑھی لگائے قاضی جی کہاں ہیں ؟"

کرشن چندر نے کہا — "نقلی داڑھی کی بجائے قاضی کا سر گنجا ہو گیا ہے۔"

گھر

دن کو بمبئی جانا پہچانا شہر معلوم ہوتا ہے اس کی حرکت، اس کا اضطراب، اس کا پیچ و تاب، اس کے کام کاج، اس کے کھیل تماشے آنکھوں میں رسے بسے معلوم ہوتے ہیں لیکن رات کو بمبئی میں سفر کرنا اور وہ بھی بارہ بجے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی انجانے اجنبی سمندر میں کشتی کھے رہے ہیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ پانی کہاں گہرا ہے کہاں پر چٹانیں ہیں. کہاں پر خوفناک بھنور پڑتے ہیں، طوفانی لہریں کدھر سے کدھر کو گھوم جاتی ہیں. بظاہر آپ دیکھتے ہیں یہ ایک رستہ ہے. یہ یونیورسٹی گراؤنڈ کے کنارے کنارے بڑے تار گھر کو جاتا ہے اس کے کنارے ایک انگریز عالم کا بت ہے جس کے قریب جامن کے دو پیڑ کھڑے ہیں لیکن رات کے وقت یہاں جیب کتروں کی ایک ٹولی ہوتی ہے. آگے چلئے تو پارسیوں کا ایک پرانا کنواں ہے، کہتے ہیں جب پارسی لوگ ایران سے بھاگ کر ہندوستان کے ساحل پر آئے

تھے تو بمبئی میں سب سے پہلے انہوں نے اس کنوئیں کا پانی پیا تھا۔ اس کنوئیں کا پانی اب ایک مقدس حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اس کنوئیں کے ارد گرد اب لوہے کا ایک مضبوط جنگلا ہے کنوئیں کے اوپر کنکریٹ کی ایک بلند و بالا عمارت ہے چاروں طرف خوش نما پنکھے ہوئے ہیں۔ کنوئیں کے پاس کنکریٹ کا ایک جالی دار طاقچہ ہے جس میں بہت سے چراغ روشن ہیں اور ان چراغوں کی روشنی طاقچے کے باہر لٹکے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے چھن چھن کر آ رہی ہے۔ دن کو یہاں پارسی لوگ بنچوں پر بیٹھتے ہیں کنوئیں کا ٹھنڈا پانی پیتے ہیں۔ اور مصروفِ دعا نظر آتے ہیں۔ رات کو اس کنوئیں کی چھجے دار عمارت کے عقب میں رام دھن فروٹ والا سوتا ہے اور غلام عباس سلک کے رومال اور عورتوں کی انگیا بیچنے والا اور یوسف سندھی فونٹین پن بیچنے والا اور نتھو چنا بیچنے والا اور اس کا رقیب مرلی دھر۔

رقیب کا ذکر آتے ہی میں چونکا۔ غور آور میں اس رستے سے گزر رہے تھے میں فلورا فونٹین کی طرف جا رہا تھا۔ غور کو بڑے تار گھر میں کچھ کام تھا اس لئے ہم دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ اور غور مجھے آس پاس کا جغرافیہ سمجھا رہے تھے۔

رقیب کیوں! میں نے غور سے پوچھا۔ کیسے؟ کوئی عورت کا جھگڑا تھا!

نہیں۔ غور تھوڑی کھجا کے ہنسنے لگا۔ دونوں کی لڑائی عورت پر نہیں ہوئی تھی سنتری پر ہوئی تھی۔ بات یہ تھی کہ آس پاس کنوئیں کے قریب جو چنے والا بیٹھتا ہے اسے دن بھر اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی ہے اس لئے نتھو اور مرلی دھر میں لڑائی ہوتی تھی دونوں یہاں چنے بیچتے تھے اور چاہتے تھے کہ دونوں میں سے صرف ایک یہاں بیٹھے اس لئے دونوں چوک کے سنتری کو اپنے اپنے طریقے سے رشوت دیتے تھے جس دن نتھو زیادہ پیسے دے دیتا اس دن پنڈت مرلی دھر کو سنتری اس پارسی کنوئیں سے ہٹا کر شہری گوکھلے کے بت کے نیچے بٹھا

دیتا جہاں دن رات کوّے بیٹ کرتے رہتے ہیں اور جس دن پنڈت مرلی دھر کا داؤ چل جاتا اسی دن نتھو کو کنوئیں سے ہٹا کر شری گوکھلے کے بت کے نیچے بٹھا دیا جاتا۔ بس رات کو دونوں کی دو تین گھنٹے لڑائی ہوتی رہتی تھی۔ ہمیشہ ذکر اُسی پری وش یعنی سنتری کا ہوتا تھا۔ ان کی لڑائی بہت دلچسپ ہوتی تھی اور وہ روز نت نئی گالیاں ایجاد کرتے تھے۔ چنانچہ گالیوں کی لغت میں دلچسپی رکھنے والے اصحاب دُور دُور سے اس مناظرے کو سننے کے لئے آتے تھے اور اکثر بیچ بیچ میں ٹوک کر کبھی ایک کو کبھی دوسرے کو شہہ دیتے رہتے تھے جس سے سماں بندھا رہتا تھا۔ رات کے بارہ بجے کے بعد یہاں بڑی رونق ہوتی تھی مگر جس دن یوسف سندھی کا قتل ہوا اُسی دن سے یہ پچھواڑہ ویران ہو گیا۔

یوسف سندھی کا قتل کیوں ہوا تھا۔ میں نے غور کا بازو پکڑ کر اُسے ٹھیرا لیا۔ ہم لوگ اس وقت کنوئیں والی عمارت کے بالکل عقب میں کھڑے تھے۔ وہاں پر اس وقت کوئی نہیں سو رہا تھا جگہ بالکل خالی تھی۔ غور کے سیاہ ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ آئی۔ اُس نے گھوم کے ہاکی گراؤنڈ کے پار اس نئے ریستوران کی طرف دیکھا جو آل انڈیا وومنز کانفرنس کے کارکنوں نے فورٹ کے علاقے کے لوگوں کے لئے سستا کھانا اور سستی چائے مہیا کرنے کے لئے کھولا تھا۔ پھر وہ آہنی جنگلے سے پیٹھ لگا کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی نیکر کی جیب ٹٹول کے ایک بیڑی سلگائی ایک مجھے دی۔ پھر میرے کندھے پر ہات رکھ کے بولا "یار تم نے کبھی اس عورتوں کے ہوٹل میں کھانا کھایا ہے۔

"ہاں۔"

"کیسا ہوتا ہے؟"

پہلی بات تو یہ ہے کہ عورتوں کے ہات کا پکایا ہوا نہیں ہوتا۔ دوسری بات یہ ہے

کہ پھیکا ہوتا ہے اور میں ذرا مزیدار چٹ پٹا مصالحے دار کھانے کے حق میں ہوں۔ تیسری بات یہ ہے کہ گو اس وقت تو پیٹ بھر جاتا ہے مگر بعد میں تھوڑی دیر کے بعد پھر بھوک چمک اُٹھتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کچھ کھایا ہی نہیں جیسے کسی نے بھوک سے دھوکا کیا ہے۔

بالکل سچ کہتے ہو۔ غور نے میرے ہات پر ہات مار کے کہا۔ ایراس سینما کا پٹھان بھی مجھ سے یہی کہتا تھا اور کامدار فرنیچر ہاؤس کا چوکیدار بھی بالکل یہی کہتا تھا۔ اور پھر آٹھ آنے کھانے کے لیتے ہیں اس سے تو ہماری دو آنے کی اُبلی ہوئی مُونگ پھلی اچھی ہے۔ بس ذرا سی پیٹ میں درد کرتی ہے۔

ہاں تو وہ قتل کا واقعہ؟

غور نے اپنی بیڑی کا لمبا کش لیا اور بیڑی کو جلا کے آدھا کر دیا۔ پھر مُنہ سے دھواں نکالتے ہوئے آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ جیسے کہیں بڑی لمبی مسافت کی ہزاروں سال پہلے کی بات کر رہا ہو۔

کہنے لگا۔ وہ سامنے جو عورتوں کا ہوٹل ہے اس میں ایک لڑکی برتن صاف کرنے کا کام کرتی تھی۔

لڑکی خوبصورت تھی: میں نے پوچھا۔

نہیں خالی جوان تھی۔ مگر سالی کیا جوان تھی۔ میں دو مرتبہ چائے پینے کے بہانے خود اُسے دیکھنے گیا۔ رام دھن فروٹ والے کی بھی اس پر نظر تھی۔

یہ رام دھن فروٹ والا کون تھا۔

سالے کو تم نے نہیں دیکھا؟ ارے کتنی بار دیکھا ہوگا۔ سالا ادھر پارسی کنوئیں کے پاس پھل بیچتا تھا جہاں نتھو اور مرلی دھر چنا بیچتے تھے۔ ان کے بیچ میں وہاں اس کی بائیسکل

گاڑی ہوتی تھی جس پر وہ فروٹ سجا کے بیچتا تھا۔ کشمیر کی ناشپاتی، کابل کے انار اور چین کے انگور اور آسٹریلیا کے سیب۔ یہ کیلا چیکو ویکو وہ نہیں بیچتا تھا۔ سالا بہت کماتا تھا اور رشوت بھی بہت دیتا تھا۔ یہ جگہ بھی بہت اچھی ہے نا۔ چرچ گیٹ اسٹیشن کے رستے پر۔ شام کے ساڑھے پانچ بجے جب کلرک لوگ دفتر سے چھوٹتے ہیں تو ہزاروں کی تعداد میں اس فٹ پاتھ پر اس کی بائیسکل گاڑی کے سامنے سے گزرتے ہیں۔ سالے کو آواز بھی نہیں دینی پڑتی تھی۔ خود یہی لوگ چلتے چلتے رُک کر اُس سے سودا خریدنے لگتے۔ ہاں تو وہ تھا رام دھن اس کا چہرہ آڑو کی طرح چمکتا تھا۔ سر گھٹا ہوا تھا۔ جس پر چٹیا ہمیشہ کھڑی رکھتا تھا۔ گلے میں ہمیشہ پان رہتا تھا۔ سالے نے تھوک تھوک کے گوکھلے مہاراج کا چبوترا گندہ کر دیا ہے۔ کسی وقت ان کو دیکھنا۔ وہی عاشق تھا اس لڑکی کا۔ مگر سالا بہت کنجوس تھا۔ جب شام کو لڑکی اپنے کام کاج سے فارغ ہو کر ادھر اس کے پاس آتی تو سالا اسے کبھی ایک آڑو یا سیب دیتا۔ بس ایک پھل اور کبھی تو وہ اس سے پیسے بھی اُدھار مانگ لیتا تھا۔ کہتا تھا آج کمائی نہیں ہوئی۔ بڑا پکّا بدمعاش تھا ایک نمبر کا۔ وہ لڑکی پہلے تو اپنے ہوٹل کے برآمدے میں سوتی تھی پھر ادھر فروٹ والے کی گاڑی کے ساتھ اپنا بوریا بچھا کے سونے لگی۔ پھر وہ روز رام دھن سے ایک کھولی لینے کے لئے بولتی تھی اور رام دھن اس سے بولتا تھا۔ کھولی تو میرے پاس ہے مگر اس پر تالا لگا ہوا ہے اور اس کی چابی میرے بڑے بھائی کے پاس ہے جو اپنے وطن میرٹھ گیا ہوا ہے۔ واپس آئے گا تو اپنے کو کھولی مل جائے گی پھر وہ تمہارا گھر ہوگا۔ لڑکی گھر کا نام سن کے بڑی خوش ہوتی تھی۔ اسی طرح تین چار چھ مہینے گزر گئے مگر رام دھن کا بڑا بھائی نہ آیا۔ نہ چابی ملی نہ کھولی — کہیں پر کھولی ہوتی تو ملتی نا۔ وہ تو سالا اُسے چکمہ دے رہا تھا۔ ایک روز کیا ہوا۔

کیا ہوا ؟

وہ لڑکی نہیں آئی ۔

نہیں آئی ۔ ؟

ہاں رام دھن رات کے تین بجے تک انتظار کرتا رہا ۔ مگر وہ لڑکی نہیں آئی یہ سالا بہت چکرایا ۔ اپنے پولیس کے دوستوں کو لے کر اِدھر اُدھر گھومنے لگا دس بارہ پیشہ وروں کے گھر بھی دیکھ ڈالے ۔ لڑکی کہیں نہیں ملی ۔ لڑکی صبح کو واپس آئی اور بہت پیئے ہوئے تھی ۔

پیئے ہوئے تھی ۔ ؟

ہاں بہت پیئے ہوئے تھی اور اس کے منہ سے بُو آ رہی تھی ۔ اور وہ تقریباً بے ہوش تھی ۔ اور رام دھن نے اسے بہت پیٹا ۔ بہت پیٹا ۔ بتا سالی کہاں مر گئی تھی ۔ بتا سالی کدھر مر گئی تھی ۔

وہ لڑکی بولی ۔ ایک مرد کے ساتھ گئی تھی ۔ وہ کہتا تھا میں تجھے اپنے گھر میں رکھوں گا ۔

پھر سالی اس کے گھر میں کیوں نہیں رہی ۔ رام دھن نے اسے ایک لات مارتے ہوئے کہا ۔ یہاں کیوں آ گئی ۔

لڑکی نے کہا ۔ وہ مجھے اپنے گھر نہیں لے گیا ۔ وہ مجھے ایک ہوٹل میں لے گیا ۔

رام دھن نے اس کے بال پکڑ کے اس کو نیچے گرا لیا اور اُس کی پیٹھ پر دو چار گھونسے زور سے مارے ۔ مگر لڑکی کو جیسے پتہ بھی نہیں تھا کہ اس کے ساتھ سلوک کیا ہو رہا ہے ۔ وہ اسی شراب کے نشے میں کہہ رہی تھی ۔ گھر نہیں ہوٹل ۔ ہوٹل نہیں برامدہ ۔ برامدہ نہیں بائیسکل گاڑی ہے بھگوان مجھے ایک چھوٹا سا گھر دے دو نا ۔ ایک ننھا سا گھر ۔ بالکل اتنا چھوٹا سا جتنی دُور تک میرے بازو پھیل سکتے ہیں ۔ اس لڑکی نے اپنے بازو پھیلا کے کہا ۔ پھر رام دھن نے اسے اور

پیٹا۔ اور پیٹا۔ مگر لڑکی مار کھانے کے بعد بھی ہوش میں نہیں آئی۔ اسی بے ہوشی کی حالت میں سو گئی اور چپ چاپ کام کرنے کے لئے چلی گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

پھر؟

پھر اس واقعے کے دو دن بعد یوسف سندھی اسی فٹ پاتھ پر آگیا۔ یوسف سندھی کو رام دھن فروٹ والے کی بغل میں جگہ ملی۔ وہ وہاں اپنا کپڑا بچھا کے سلک کے رومال بیچتا تھا۔ کبھی فونٹین پن۔ کبھی جرابیں۔ کبھی لکھنے کے کاغذ بڑا چالاک تھا۔ دبلا پتلا گورے رنگ کا لڑکا تھا۔ آنکھیں بڑی تیزی سے اِدھر اُدھر گھومتی تھیں۔ بڑی جلدی جلدی بات کرتا تھا۔ دوسرے آدمی کو سوچنے کا موقع نہیں دیتا تھا۔ بڑی جلدی اس نے یہاں اپنا رنگ جمالیا۔ پتہ نہیں سالا کہاں سے چیزیں نکال کے لاتا تھا۔ بازار سے ہمیشہ سستا بھاؤ اس کا ہوتا تھا۔ دھڑا دھڑ اس کی بکری ہوتی تھی۔ اس فٹ پاتھ پر میں نے بڑے بڑے تیز بیچنے والے دیکھے مگر یوسف سندھی کا جواب نہیں تھا۔ بس دو تین گھنٹے دکانداری کرتا تھا۔ ایک تو صبح دس سے گیارہ تک۔ پھر شام کو چار سے چھ تک۔ بس سارا مال ختم کر ڈالتا تھا۔ پھر دن بھر کیا کرتا تھا یہ ہم کو معلوم نہیں۔ اس سالے کے پاس بھی سونے کی جگہ نہیں تھی۔ وہ بھی رام دھن کے قریب اسی کنوئیں کی عمارت کے پچھواڑے میں سونے لگا۔ آہستہ آہستہ اس نے لڑکی سے ملنا شروع کر دیا۔ ایک دفعہ اسے سلک کا رومال دیا۔ پھر اُسے نو گز کی ایک سوتی ساڑھی لا کے دی۔ سالا تھا بڑا فضول خرچ۔ رام دھن کی طرح کنجوس نہیں تھا۔ بہت جلد اس نے لڑکی کو اپنی طرف کر لیا۔ مگر ایمان کی بات کہتا ہوں کہ یوسف اس لڑکی کے لئے ہی تھا۔ بولتا تھا میں تجھ سے شادی کروں گا۔ تیرے لئے ایک کھولی لوں گا۔ تجھ کو وہاں ایک رانی کی طرح رکھوں گا۔ اگر وہ زندہ رہتا تو سچ مچ یہ سب کرتا۔ مگر بے چارا مارا گیا۔ جس روز اس نے سو روپے دے کے پریل میں کھولی لی اسی رات

کو مارا گیا صبح وہ لوگ اپنی کھولی میں جانے والے تھے جیسا کہ نتھو چنے والے نے پولیس میں بیان دیا وہ لوگ اس رات بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے ۔ دیر تک دھیمے دھیمے سروں میں فلموں کے پریم گیت گاتے رہے ۔ جیسے اس رات سچ مچ ان کی شادی ہو رہی ہو ۔ چھ مہینے کی محنت کے بعد سو روپے جوڑ کے یوسف نے پریل میں کھولی لی تھی ۔ آج تو وہ ہوٹل سے بہت سا کھانا لایا تھا ۔ جسے یوسف اور اس لڑکی اور نتھو چنے والے نے مل کر کھایا ۔ اور مُرلی تو پنڈت تھا ۔ اس لئے اُس نے نہیں ۔ اور رام دھن نے تو کئی مہینوں وہاں سونا چھوڑ دیا تھا ۔ اب وہ اپنی گاڑی کو وہیں گھوکھلے بُت کے چبوترے کے نیچے رکھتا اور وہیں سوتا تھا اور جب یوسف سندھی کی طرف دیکھتا تو گھور کر اپنی چوٹی کو بل دینے لگتا ۔ کیونکہ مونچھیں تو سالے کی تھیں نہیں کہ انہیں بل دیتا ۔ مگر سندھی بھی کچھ نہیں کہتا تھا ۔ ایک دفعہ تو یہاں تک ہوا کہ یوسف نے اسی لڑکی کو رام دھن کی گاڑی سے پھل خرید کے دیئے ۔ رام دھن نے چپ چاپ پھل دے دیئے ۔ زبان سے کچھ نہیں بولا ۔ وہیں لڑکی سے باتیں کرتے کرتے یوسف نے لڑکی سے پوچھا ۔ آج کون سا سینما دیکھیں گے ۔ ہاں یہ بات تو میں بھول گیا ۔ رام دھن لڑکی کو کبھی سینما نہیں لے گیا تھا ۔ مگر یوسف نے نہ جانے کتنی بار اس لڑکی کو سینما دکھایا تھا ۔ اس رات کو بھی جب وہ صبح اپنی کھولی میں جانے والے تھے یوسف اسے سینما لے گیا تھا ۔ سینما جانے سے پہلے یوسف نے بڑے فخر سے لڑکی کی طرف دیکھ کر کہا تھا ۔ دیکھو نتھو میں یوسف ہوں ، یہ میری زلیخا ہے ۔ سینما سے آکے دونوں وہیں زمین پر نتھو کے پاس سو گئے ۔ نتھو کہتا ہے اس نے انہیں سینما سے آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا ۔ ایک بارگی آدھی رات کو اُس کی نیند کُھل گئی ۔ لڑکی چیخ رہی تھی اور یوسف سندھی کا سر دھڑ سے الگ اُس کے سامنے پڑا تھا ۔ اور یہ ساری زمین خون سے بھری ہوئی تھی ۔

رام دھن نے مارا؟ میں نے پوچھا۔

غورے نے بیڑی کا کش لگایا مگر بیڑی بجھ چکی تھی۔ اُس نے بیڑی کو زمین پر پھینک کے مسل دیا۔ بولا سالے کو پھانسی ہونی چاہیے۔ آؤ، آگے چلیں۔

ہم دونوں چپ چاپ جنگلے سے لگے لگے بڑے تار گھر کی طرف بڑھتے گئے۔ نٹ پاتھ پر چڑھ کے ایک سینکر کا درخت آتا ہے۔ اس کے تنے کے نیچے ایک عورت سوئی پڑی تھی غور سے اُسے دیکھا پھر مجھے اپنے قریب بلا کے کہا۔ دیکھ لو۔ یہ وہی لڑکی ہے، اب عورتوں کے ہوٹل سے نکالی جا چکی ہے۔ کتنے دن حوالات میں رہی۔ کتنے دن جانے کہاں کہاں پاگلوں کی طرح گھومتی رہی۔ اب پھر یہیں آ رہی ہے۔ مگر اب اُس کا دماغ ٹھیک نہیں ہے۔ یہ دن بھر اسی درخت کے نیچے بیٹھی میٹھی کنوئیں کی طرف دیکھتی رہتی ہے کبھی جہاں یوسف سندھی کا قتل ہوا تھا، اس جگہ کی زمین کھودنے لگ جاتی ہے اور جب لوگ ہنس کے پوچھتے ہیں۔ پگلی تو یہاں کیا ڈھونڈ رہی ہے تو چلا کے کہتی ہے میں اپنا گھر ڈھونڈ رہی ہوں۔

سینکر کے سیاہ سائے میں وہ سیاہ لڑکی سوئی پڑی تھی۔ سائے کے اندر ایک گہرا سایہ۔ اس کے سیاہ خشک، اُلجھے ہوئے بال اُس کے ماتھے اور اُس کی آنکھوں کو چھپائے ہوئے تھے۔ اُس کی ٹانگیں گھٹنوں تک ننگی تھیں۔ پھٹی ہوئی ساڑھی کمر کے قریب اُڑسی ہوئی تھی اور اس میں اس نے کوئی وزنی چیز چھپا کے رکھی تھی۔

میں نے غورے سے پوچھا۔ یہ اس نے ساڑی میں کیا باندھ کے رکھا ہے۔ روٹی؟

نہیں پتھر۔ یہ اِدھر اُدھر سے بڑے بڑے پتھر اکٹھے کر کے لاتی ہے اور پھر انہیں کنوئیں کے پانی سے نہلاتی ہے اور جب لوگ پوچھتے ہیں۔ پگلی یہ تو کیا کر رہی ہے۔ تو کہتی ہے۔ دیکھتے نہیں ہو۔ میں اپنے بیٹے کو بلا رہی ہوں۔ اسے نہلا دھلا کے میں اُسے دودھ پلاؤں

گی اور پھر اسے اسکول بھیجوں گی۔

سیاہ لڑکی کے دونوں ہات خالی تھے۔ اس کا پیٹ ننگا تھا اور اس کے چاروں طرف ڈھول تھی۔ یہ اچھا ہے کہ میں اس کی آنکھیں نہیں دیکھ سکتا۔ شاید میں ان آنکھوں کے اندر کبھی نہ جھانک سکتا۔ اتنی ہمت مجھ میں نہ ہوتی۔ وہ آنکھیں جو اگر مجھ سے کوئی سوال کر بیٹھتیں تو انہیں کیا جواب دیتا۔ کیونکہ ان میں سوال اس طرح سامنے نہیں آتے۔ دن میں آدمی کام کرتا ہے اور اکثر محسوس نہیں کرتا ہے اگر کرتا بھی ہے تو اپنے کام میں اتنا مصروف ہوتا ہے کہ اپنے جذبات و حسیات کو اُبھرنے کا موقع نہیں دیتا۔ لیکن جب رات ہوتی ہے تو یہ جذبات خود بخود اُمڈ کر باہر آجاتے ہیں اور پھر رات کو بمبئی کی مہیب اور تاریک دیواریں ملگجی روشنی میں ٹھٹھرتے ہوئے پورچ۔ اور آسمان کی طرف تکتے ہوئے خاموش گنبد اور سقف ایسے عجیب و غریب سوال پوچھتے ہیں کہ اُن سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے جیسے میرے لئے اس وقت اس عورت سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو رہا تھا۔ یہ عورت جو تلسی کے پودے کی طرح گمبھیر اور مقدس ہو سکتی تھی۔ یہ عورت جو شاخِ گلاب کی طرح کسی آنگن کی پہنائی کو مہکا سکتی تھی۔ یہ عورت جو اپنے آنچل کے سائے میں سو بہاروں کو جنم دے سکتی تھی۔ کیوں اس وقت اپنے سینے سے ایک پتھر کو چمٹائے فرشِ خاک پر کٹی ہوئی ٹہنی کی طرح پڑی تھی۔

کیوں ؟ کیوں ؟

کنواری

میگی ایلیٹ استی برس کی پروقار خاتون ہیں۔ بڑے قاعدے اور قرینے سے سجتی ہیں۔ یعنی اپنی عمر اپنا مرتبہ، اپنا ماحول دیکھ کر سجتی ہیں۔ لبوں پر ہلکی سی لپ اسٹک، بالوں میں دھیمی سی خوشبو، رخساروں پر رُوژ کا شائبہ سا۔ اتنا ہلکا کہ گالوں پہ رنگ معلوم نہ ہو۔ کسی اندرونی جذبے کی چمک معلوم ہو۔ ہر شام اُن کی لاغر کلائی کا کنگن بدل جاتا ہے۔ میگی ایلیٹ کے پاس چاندی کے چھ سات کنگن ہیں۔ جنھیں وہ بدل بدل کے پہنتی ہیں۔ کسی مرد کو اپنے قریب دیکھ کر میگی ایلیٹ آج بھی اچانک گھبرا جاتی ہیں۔ پھر رُک کر کچھ عجیب طرح سے شرما کر مسکراتی ہیں۔ جیسے یہ مسکراہٹ دیکھنے والے سے اپنا بدن چرا رہی ہے۔ اس مسکراہٹ کو دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ مس میگی ایلیٹ اپنی طویل عمر کے باوجود ابھی تک کنواری ہیں۔ ان کے تبسم میں ایک عجیب ان چھوئی سی کیفیت ہے۔

میگی ایلیٹ بیرونٹ کریم بھائی کے خاندان میں ستائیس برس کی عمر میں آگئی تھیں۔ وہ کارنوال کی رہنے والی تھیں۔ بیرونٹ کریم بھائی انہیں لندن سے اپنی سیکرٹری بنا کے لائے تھے۔ اور میگی ایلیٹ نے بھی بمبئی جانا اس لئے پسند کر لیا کہ وہ انگلینڈ میں اپنی محبت کی بازی ہار چکی تھیں۔ وہ اس تکلیف دہ ماحول سے دُور بھاگ جانا چاہتی تھیں جہاں انہیں اپنی محرومی کا احساس کسی پالتو کتے کی طرح ہر دم اپنے پیچھے پیچھے تعاقب کرتا ہوا نظر آتا تھا۔ وہ لندن چھوڑ کر بمبئی آگئیں۔ مگر سیکرٹری کی حیثیت سے دیر تک چل نہ سکیں۔ کیونکہ ابھی محبت کی محرومی کا احساس نیا نیا تھا۔ اس لئے بیرونٹ کریم بھائی سے ملاقات کرنے کے لئے آنے والے مردوں کیساتھ بلا ضرورت تلخی کا سلوک کر بیٹھتیں۔ بیرونٹ کریم بھائی نے انہیں سیکرٹری کے عہدے سے الگ کر دیا۔ مگر نرم دل کے آدمی تھے۔ اس لئے انہوں نے میگی ایلیٹ کو مسز کریم بھائی کی سیکرٹری بنا دیا۔

کئی برس میگی ایلیٹ مسز کریم بھائی کی سیکرٹری رہیں۔ جب مسز کریم بھائی کی وفات ہو گئی تو انہیں مسز کریم بھائی کے بچوں کی گورنس بنا دیا گیا۔ بیرونٹ کریم بھائی مر گئے بچے جوان ہو گئے۔ لڑکیوں کی شادی ہو گئی۔ وہ خاندان سے باہر چلی گئیں۔ مگر میگی ایلیٹ خاندان کے اندر ہی رہیں۔ اب وہ بیرونٹ کریم بھائی کے سب سے بڑے لڑکے ارشاد کریم بھائی کی بیوی سکینہ کو انگریزی پڑھانے اور مغربی آداب سکھانے پر مامور تھیں۔ اور ان دنوں بیرونٹ کریم بھائی کے خاندان کے ساتھ بمبئی سے مسوری آئی ہوئی تھیں۔ کیونکہ گرمیوں میں بیرونٹ مرحوم کا سارا خاندان مسوری آتا تھا۔ ڈنل ڈوک کے مشہور دیوداروں والی گھاٹی پر دو منزلہ کریم کاٹیج انگریزی گھاس والے لان اور انگریزی پھولوں والے قطعوں اور سلیٹی بجری والی روشوں اور سکینہ کریم بھائی کی اونچی سوسائٹی والی پارٹیوں کی وجہ سے بے حد مشہور تھا۔ جی۔ سی

کلب کی کیفیت مشکل نہ تھی مگر سکینہ کریم بھائی کی دعوتوں میں بلایا جانا بہت مشکل تھا۔ اور اس کے لئے بڑی تگڑم کرنا پڑتی تھی۔ میں چونکہ تاش کا عمدہ کھلاڑی ہوں۔ اور سکینہ کو برج سے عشق ہے۔ اس لئے میں اپنی دو ہزار روپے ماہوار کی قلیل آمدنی کے باوجود کریم کاٹیج کی دعوتوں میں بلایا جانے لگا۔ پھر اسی تاش کے چسکے کے طفیل سکینہ مجھے سہ پہر کی چائے پر بھی بلانے لگی۔ ہوتے ہوتے میرے دن کا بیشتر حصہ کریم کاٹیج میں گزرنے لگا اور سکینہ کی لڑکی عائشہ مجھے میٹھی میٹھی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ دیکھتی رہے، کیا ہرج ہے، اوّل تو سکینہ خود اس قدر سمجھدار ہے کہ اپنی سب سے بڑی لڑکی کو کبھی اپنی آنکھ سے اوجھل نہیں ہونے دیتی۔ پھر مس بلنٹ اس قدر محتاط رہتی ہیں۔ پھر میں خود اس قدر ڈرپوک ہوں کہ کبھی کسی لڑکی کو لے کر بھاگ نہیں سکتا۔ اس لئے میٹھی میٹھی نگاہوں سے دیکھنا، انگلیوں کو چھو لینا، عائشہ کے ہاتھ سے چائے کا پیالہ لے لینا، اُس کی بڑھائی پلیٹ سے مورین کریم کھا لینا اور کبھی کبھی تاش کے دَوران میں ذرا مخصوص لہجہ میں اُسے پارٹنر کہہ دینا بھی میرے لئے کافی ہے۔ چلیئے زندگی میں پارٹنر نہ بنے تاش کے کھیل میں بن گئے! اور یوں غور سے دیکھا جائے تو زندگی کی بازی بھی ایک طرح سے تاش کا کھیل ہے۔ اس میں کبھی ہار ہے کبھی جیت ہے۔ کبھی پتے اچھے آتے ہیں کبھی بُرے آتے ہیں۔ کبھی پارٹنر سے جھگڑا ہوتا ہے۔ صلح صفائی بھی ہوتی ہے۔ حساب کتاب بھی ہوتا ہے۔ اس طرح اپنے پتے کھیلتے کھیلتے ہم بھول جاتے ہیں کہ ان پتوں سے باہر بھی کوئی دنیا ہے۔ جہاں گلاب کھلے ہیں۔ مالی کی بیوی بیمار ہے۔ ایک لکڑہارا لکڑیاں لے کر بیچنے کے لئے لے جا رہا ہے۔ ڈونڈی والوں کے کپڑے پھٹے ہیں۔ آسمان پر سفید بادل گھوم رہے ہیں دیودار کی شاخ میں بلبل نے گھونسلہ بنایا ہے۔ مالی کے بیٹے نے گو پھیا سنبھالا ہے۔ یکایک ہوا کا ایک جھونکا آتا ہے۔ چنبیلی کے پھولوں کی خوشبو فضا میں تیرنے لگتی ہے۔ اور عائشہ تنگ

رنجیدہ سے کہتی ہے ،، کیا سوچ رہے ہو؟ اپنا پتا جلدی سے چلو۔

میں گھبرا کر اپنے پتے دیکھنے لگتا ہوں۔ کیونکہ تاش کا کھیل کسی کے لئے زیادہ دیر تک رُک نہیں سکتا۔ پھر وہ وقت بھی آئے گا جب زندگی کی ساری تاش سمیٹ کر الگ رکھ دی جائے گی۔ تمہاری قسمت کا بادشاہ اور یکہ بیگم اور غلام سب دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ اور تم اس تاش میں سے ایک پتا نکال نہ سکو گے۔ کسی کو پار ٹنر نہ کہہ سکو گے۔ تمہاری بازی ختم ہوئی۔ اور بس اتنی ہی تمہاری بازی تھی۔ اس لئے اپنا پتا جلدی سے چلو۔

اصل میں جو میں اس طرح سے سوچتا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ایک دفعہ محبت کی بازی ہار چکا ہوں۔ دوبارہ زندگی کو داؤ پر لگانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ میری طرح سنا ہے، مس ایلیٹ بھی اس میدان میں ہار چکی ہیں۔ مگر پھر بھی داؤ لگانے سے باز نہیں آتیں۔ یہ بھی ان کی زندگی سے گہری محبت کا ثبوت ہے۔ ہمیشہ مجھ سے چہل کرتی رہتی ہیں۔ حالاں کہ جانتی ہیں۔ کچھ نہیں ہو سکتا۔ بھلا بتیس برس کے مرد اور اسی برس کی عورت کے درمیان کیا ہو سکتا ہے۔ مگر چہل کرنے سے باز نہیں آتیں۔ ”پاشا اپنے ماتھے کی لٹ سنبھال لو۔ ورنہ میرا دھیان اپنے پتوں میں نہیں رہ سکتا۔“ ”پاشا، کہاں دیکھ رہے ہو، کیا دیودار کے اس پیڑ پر تاش کے پتے لٹکے ہیں — ؟“ — اب کے میں ضرور جیتوں گی۔ کیونکہ میرے پتوں میں ایک پاشا بھی ہے۔“ وہ میرے نام کی خاطر بادشاہ کو پاشا کہنے لگی ہیں۔ مس ایلیٹ کے معصوم مذاق سے سبھی محظوظ ہوتے ہیں۔ عائشہ بھی ہنس دیتی ہے۔ پھر میری طرف دُزدیدہ نگاہوں سے دیکھ کر آنکھیں جھکا لیتی ہے۔ وہ جھکی جھکی آنکھیں مجھے اپنے پاس بلاتی ہیں۔ فاصلہ بھی زیادہ نہیں ہے۔ میں دونوں ہاتھ بڑھا کر عائشہ کو اپنے بازوؤں میں لے سکتا ہوں۔ مگر میں نہیں لے سکتا۔ تاش کھیلنے والے دوسرے بھی تو ہوتے ہیں۔ ایک طرف عائشہ کی ماں سکینہ بیٹھتی ہے۔ دوسری طرف کریم

بھائی اسٹیٹ کے مینجر فاضل بھائی بیٹھے ہیں۔ جنھوں نے عائشہ کے لئے نیروبی کے ایک کروڑپتی تاجر کا بیٹا ڈھونڈ رکھا ہے۔ زندگی کی تاش کس قدر آسان ہوتی اگر دوسرے کھیلنے والے نہ ہوتے اب تم ان سہمی سہمی نگاہوں کے چھوٹے چھوٹے پتے میری طرف کیوں پھینکتی ہو عائشہ۔ اِن دگی تگیوں سے کیا ہوگا۔ جب کہ یکہ اور بادشاہ بیگم اور غلام اور نہلے پر دہلا دوسروں کے ہاتھ میں ہیں۔ ؟ نو بڈ پارٹنرز:

اپنا ہنسی مذاق مس ایلیٹ سے تو چلتا ہی تھا۔ مگر اس کی کیفیت ایک معصوم چہل سے زیادہ نہ تھی۔ البتہ ماسٹر متین احمد کے سلسلے میں مس ایلیٹ زیادہ سنجیدہ نظر آتی تھیں۔ اور دن بدن گہری دل چسپی کا ثبوت دے رہی تھیں۔ ماسٹر متین احمد یہاں مسوری میں آکر تین ماہ کے لئے ملازم رکھے گئے تھے۔ بچوں کو پڑھانے اور ان کی دیکھ بھال کرنے کے لئے۔ اسٹیٹ مینجر فاضل بھائی نے بہت سوچ سمجھ کے متین احمد صاحب کو مقرر کیا تھا۔ کیونکہ ماسٹر متین احمد خاصے بوڑھے تھے۔ ستر برس کے قریب عمر ہوگی۔ دو بیویاں یکے بعد دیگرے وفات پا چکی تھیں۔ پوتوں اور نواسوں والے تھے۔ چھڑی ٹیک کر اور سر جھکا کر اور اپنی گری ہوئی مونچھوں کو اور بھی گرا کر چلتے تھے۔ سرخ و سپید رنگت میں بڑھاپے کا پکا پن اور بڑھاپے کی جھریاں آگئی تھیں۔ مگر اس عمر میں بھی حوصلہ جوان رکھتے تھے۔ اور دلگیر تخلص کرتے تھے۔ اپنا کلام جو آج تک کہیں نہ چھپا تھا۔ مس ایلیٹ کو ہر روز سناتے تھے۔ مس ایلیٹ ہر چند کہ اردو شاعری میں کوئی استعداد نہ رکھتی تھی۔ اب مصرعہ پر مصرعہ اُٹھاتی تھیں۔ اور اس کوشش میں رہتی تھی کہ کسی طرح گرہ بھی لگ جائے۔ حالاں کہ اس نیک دل خاتون کی شاعرانہ صلاحیتوں کی معراج ٹونکل ٹونکل لٹل اسٹار سے آگے نہ بڑھی تھی۔ مگر اب وہ دونوں ماسٹر متین احمد اور مس میگی ایلیٹ کبھی برآمدے کے کسی کونے میں بیٹھے ہوئے، کبھی کسی لان پر ٹہلتے ہوئے، ڈنلپ ڈوک کے

دیوداروں میں گھومتے ہوئے شاعری پر بحث کرتے رہتے تھے ۔ اور بحث کے دوران میگی ماسٹر جی کا مفلر ٹھیک کرتی جاتی تھیں ۔ ورنہ سردی لگ جانے کا اندلیشہ ہے ۔ اور سردی میں شعر ٹھٹھر جاتے ہیں ۔ کبھی اُن کے سر کی ٹوپی کا رُخ بدل دیتی تھیں کہ "یوں زیادہ اچھا لگتا ہے" کبھی ان کا ہاتھ پکڑ کے ڈوک کے نالے کے پتھروں پر قدم جما کے چلتی ہوئی نالہ پار کر جاتیں ۔ ہر روز شام کو نالہ پار کرنا ضروری تھا ۔ مرد کے بازو کا سہارا کتنا اچھا لگتا ہے ۔ مرد کی انگلیوں کا مضبوط لمس جیسے کسی کمزور بیل کو پیڑ مل جائے ۔ صحت میں آج بھی میگی ماسٹر جی سے بہتر نظر آتی تھیں ۔ مگر نالہ دیکھتے ہی چھ سال کی بچی کی طرح ڈرنے اور کانپنے لگتی تھیں ۔ اور اپنے سارے جسم کا بوجھ غریب ماسٹر جی پر ڈال دیتی تھیں ۔ ماسٹر جی ہانپتے کانپتے ہونٹ چباتے دمے کے مریض کی طرح سانس لیتے ہر روز بڑی بہادری سے مس ایلیٹ کو نالہ پار کرا دیتے تھے ۔ پھر دم اس قدر پھول جاتا کہ نالے کے اس پار پتھر پر بیٹھ کر دیر تک منہ سے کچھ نہ بول سکتے ۔ وادی کا منظر دیکھتے رہتے ۔ اپنے سانس کی دھونکنی ٹھیک کرنے میں انہیں کئی منٹ لگ جاتے ۔ مگر وہ خاموشی کے اس لمبے وقفے کو کسی طرح اپنی جسمانی کمزوری پر محمول کرنے کے لئے تیار نہ تھے ۔ جب دم میں دم آتا تو کہتے "یہاں سے وادی کا منظر اس قدر خوبصورت دکھائی دیتا ہے کہ یہاں آتے ہی میں دم بخود ہو جاتا ہوں ۔ منہ سے کچھ بول نہیں سکتا ۔"

"یہی حالت میری بھی ہوتی ہے ۔" میگی بھی اپنی پھولی ہوئی سانس کو قابو میں کرتے ہوئے کہتی ۔ "یہ وادی بالکل تمہاری شاعری کی طرح خوبصورت ہے ۔"

بہت دیر تک وہ دونوں چپ رہتے ۔ کیونکہ واپسی میں نالے کو پھر پار کرنا ہوتا ۔ ماسٹر متین احمد بڑی ناامیدی سے نالے کو دیکھتے اور ان کی ہمت ڈوب ڈوب جاتی ۔ اور وہ دل ہی دل میں سوچتے ۔ کل سے میں میگی کو اِدھر سیر کرانے کے لئے نہیں لاؤں گا ۔ مگر میگی کی یہی

تو ایک کمزوری تھی۔ نالے کے اس چند گز کے پاٹ میں وہ سب۔ کچھ پالیتی تھی۔ وہ سب کچھ جو اُسے زندگی میں کبھی نہ ملا۔ اس مختصر سے فاصلے میں وہ کسی کی بیوی ہو جاتی۔ کسی کا سہارا لے لیتی کسی کے کندھے سے سر لگا لیتی۔ کسی کی قربت کا احساس کر لیتی۔ بالکل اس الہڑ کنواری کی طرح ہو جاتی جو کسی خطرے کے سہمے اپنے آپ کو بچانے کے لئے کسی مرد سے لپٹ جاتی ہے۔ نالے کے پار جا کر وہ پھر ایک انگریز عورت، ہو جاتی تھی۔ اپنے آپ میں مکمل، مضبوط اور خود مختار۔ مگر نالہ پار کرتے ہوئے کمزوری کے یہ چند لمحے بڑے قیمتی ہوتے تھے۔ اور وہ ہر روز بڑی بے صبری سے ان چند لمحوں کا انتظار کرتی تھی۔

پھر ایک دن اس کی زندگی میں پام آگئی۔ پامیلا تھوراٹ اس کی بمبئی کی سہیلی تھی۔ پامیلا نے بمبئی کے ایک تاجر سے شادی کی تھی۔ چند سال بمبئی میں رہ کر مسٹر تھوراٹ اور ان کی بیوی منگلور چلے گئے تھے۔ چند سال خط و کتابت ہوتی رہی۔ پھر خط و کتابت بند ہو گئی۔ اب بیس بائیس برس کے طویل وقفہ کے بعد جب پامیلا تھوراٹ اچانک مسوری میں اُسے نظر آگئی تو دونوں سہیلیوں کی خوشی دیکھنے کے لائق تھی۔ نہ صرف یہ کہ دونوں نے کئی منٹ تک مصافحہ کیا۔ بلکہ آواز میں لرزش بھی تھی۔ اور آنکھ میں آنسوؤں کا شبہ تک پیدا ہو گیا تھا۔

پام اس عرصہ میں دو شوہر بھگت چکی تھی۔ وہ بے چارے دونوں مر چکے تھے۔ مگر پام ساٹھ برس کی ہو کر بھی اپنی شوخی و طراری کو ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھی۔ اپنی فطرت میں پام میگی سے بالکل الگ تھی۔ میگی دبلی پتلی تھی تو پام موٹی۔ میگی سنجیدہ تھی تو پام بات بے بات قہقہہ لگانے والی۔ میگی ہلکا سا میک اپ کرتی تھی تو پام بالکل گہرا۔ بالکل جوان عورتوں سا میک اپ کرتی تھی۔ اس کی آواز ابھی تک بہت اچھی تھی اور اُسے بہت سے فحش لطیفے یاد تھے۔ اس کی کوئی اولاد نہ تھی۔ پہلے شوہر سے ایک لڑکی ہوئی تھی وہ دو سال کی عمر میں

چل بسی۔ دوسرا شوہر ایک اینگلو انڈین تھا۔ وہ ہر وقت شراب میں وھت رہتا تھا۔ اور کبھی کبھی اسے پیٹتا بھی تھا۔ کبھی کبھی مرد پیٹے تو بڑا مزہ آتا ہے۔ پام نے میگی کو سرگوشی میں بتایا۔ کیونکہ اس کے بعد مرد پر پچھتاوے کا ایک شدید دورہ پڑتا ہے۔ اس میں وہ عورت کو بڑی شدت سے منانے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس دورے میں بڑی احمقانہ باتیں کرتا ہے۔ روتا ہے۔ ہاتھ جوڑتا ہے۔ پاؤں پڑتا ہے۔ کبھی کبھی اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر نیا فراک تک سوا دیتا ہے۔ پام کو جب بھی کسی نئے فراک کی ضرورت ہوتی تھی وہ اپنے شوہر کو کسی نہ کسی طرح پیٹنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ شوہر رکھنا عمدہ چیز ہے مگر آہ .... اب تو بڑھاپا آگیا۔ پام اک آہ بھر کے چپ ہو گئی۔

"تم تو بالکل بچہ ہو۔ بالکل بچہ!" میگی نے بڑی عمر کی بہن کا رشتہ لیا۔ اور پام کی بھی لٹ ٹھیک کرنے لگی۔ "یہ بال کیسے بنا رکھے ہیں....؟ میگی کے لہجے میں۔ ماںتا کی لرزش سی آ گئی جسے سن کر پام کچھ اور پھیل گئی۔ اٹھلا کر بولی۔

"اب ہم سے نہیں ہوتا میگی۔"

"تم کہاں ٹھہری ہو؟" میگی نے پام سے پوچھا۔

"پہلے تو کلارکس میں ٹھہری تھی۔ ایک گجراتی فیملی کے ہمراہ احمد آباد سے آئی تھی۔ ان لوگوں کو جلدی واپس جانا پڑ گیا۔ خاندان میں کوئی موت ہو گئی تھی۔ وہ لوگ سب چلے گئے ہیں۔ مگر میں ایسی گرمی میں واپس احمد آباد نہیں جا سکتی۔ اس لئے میں ان کی ملازمت سے الگ ہو گئی ہوں۔ اور اب مسز ٹریورز کے چھوٹے سے بورڈنگ ہاؤس میں ٹھہری ہوں۔ بڑی کمینی عورت ہے۔ ابھی تک دو روز کی ابلی ہوئی پتیوں کی چائے پلتی ہے۔ جیسے یہ مسوری نہ ہو انگلینڈ ہو۔ اور جنگ ابھی تک جاری ہو۔"

میگی پامیلا کو مسز ٹریورز کے بورڈنگ ہاؤس سے کریم کاٹیج میں اُٹھا لائی۔ اور اس سے ایسی محبت اور شفقت سے پیش آنے لگی، جیسے پام اُس کی برابر کی سہیلی نہ ہو۔ کوئی چھوٹی سی بچی ہو۔ میگی پام کے بال بناتی۔ پام کے کپڑے نکالتی۔ اس کے کپڑوں پر استری کرتی۔ اس کو مشورہ دیتی، وہ کون سی چیز کھائے، کون سی چیز نہ کھائے۔ کبھی کبھی اُسے ایک سخت گیر ماں کی طرح ڈانٹ بھی دیتی۔ اور پام میگی کی محبت پاکر بے طرح اٹھلانے لگی تھی۔ اور ساٹھ برس کی ہوکر تیس برس کی خاتون کی سی ادائیں دکھانے لگتی اور جب دیکھتی کہ میگی کی محبت بہت زور مار رہی ہے تو تتلا تتلا کر باتیں کرنے لگتی!

اب میگی پام اور ماسٹر جی (ماسٹر متین احمد) کا تگڈم بن گیا تھا۔ تینوں برآمدے کے دوسرے کونے میں الگ جاکر بیٹھتے تھے۔ تاش کھیلتے تھے۔ اپنی بیماریوں اور ان کی دواؤں پر مختلف زاویوں سے بحث کرتے تھے۔ اور ہر وقت تین شریر بچوں کی طرح مسرور اور مگن نظر آتے تھے۔ آپس میں ان کی کیا باتیں ہوتی تھیں، یہ تو ہم نہیں جان سکے۔ البتہ اتنا ضرور احساس ہونے لگا کہ ان تینوں میں گاڑھی چھن رہی ہے۔ ماسٹر جی جو پہلے میگی پر اپنی پوری توجہ صرف کرتے تھے۔ اب میگی کے اصرار کرنے پر پام پر بھی کسی قدر اپنی توجہ دینے لگے۔ آہستہ آہستہ یوں ہوگیا کہ تعلقات برابر کے ہوگئے۔ ماسٹر جی اپنی آدھی توجہ میگی اور آدھی توجہ پام کو دیتے تھے۔ اور کسی طرف ڈنڈی نہ مارتے تھے۔ بہت دنوں تک یہ سلسلہ چلا۔ پھر ہوتے ہوتے غیر شعوری طور پر پام کی طرف پلڑا جھکتا چلا گیا۔ کیونکہ پام ساٹھ برس کی تھی اور میگی اسی برس کی تھی۔ پام کے چہرے پر جھریاں بہت کم تھیں۔ اور پام کسی قدر زندہ دل تھی۔ اور کیسے عمدہ لطیفے سناتی تھی۔ میگی کی روح بلاشبہ پام سے بہتر معلوم ہوتی ہے۔ اس کے جذبے میں سچائی اور شدت بھی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ مگر جسم کو جدھر سے دیکھو ہڈیاں سی نکلی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ اور پام تو بالکل گرم پانی

کی بھری ہوئی ربڑ کی بوتل کی طرح آرام دہ معلوم ہوتی ہے۔ اور شہریار کا پلڑا اپنی طرف جھکتے دیکھ کر غریب ماسٹر کو اور بھی الکانے لگی اور اکسانے لگی۔ اور اپنی سہیلی کی ساری خاطر مدارت بھول کر اُسے جلانے پر تُل گئی۔

بے حیا بلی! میگی نے دل ہی دل میں سوچا۔ پہلے تو میگی نے طرح دی۔ اور بار بار وہ طرح دیتی رہی۔ کبھی نگاہیں پھیر لیتی۔ جیسے اُس نے کچھ دیکھا نہ ہو۔ پھر یوں غائب ہو جاتی جیسے اُس نے کچھ سنا نہ ہو۔ پھر جب دل خون ہونے لگتا۔ اُس وقت بھی یوں ہنس دیتی جیسے کچھ ہوا نہ ہو۔ مگر پلڑا جھکتا ہی گیا۔ اور ہم دیکھتے رہے۔ اور ان تینوں سے دُور ہی دُور اپنے برج کی میز سے اس دلچسپ ڈرامے کو دیکھتے رہے جواب اپنی معراج کو پہنچ رہا تھا۔

ایک مہکتی ہوئی نارنجی شام میں جب ہوا کی خنکی بڑھ گئی تھی اور ہم لوگ جی۔ سی۔ کلب میں جانے کی تیاری کر رہے تھے عائشہ اور میں کالے سنگ مرمر کے شیروں والے چبوترے پر کھڑے سکینہ اور فاضل بھائی کا انتظار کر رہے تھے جو اپنے اپنے کمرے میں کپڑے بدلنے گئے تھے۔ گئی تو عائشہ بھی تھی مگر کمرے سے جلدی نکل آئی تھی۔ کیونکہ اس طرح سے ہم دونوں کو اکیلے میں ساتھ رہنے کے لئے چند منٹ مل جاتے تھے۔ اس وقت عائشہ ایک کالے شیر کی پیٹھ پر بیٹھی ہوئی تنک مزاجی سے بار بار اپنے دائیں پاؤں کا سینڈل ہلا رہی تھی۔ اور قریب کے مرمریں ستون پر چڑھی ہوئی زرد گلاب والی بیل سے پھولوں کی کچی کلیاں توڑ توڑ کر میرے پاؤں پر پھینک رہی تھی۔ ایک کلی میری پتلون کی مہری میں جا اٹکی اور میں اسے نکالنے کے لئے جو جھکا تو مجھے عائشہ کا سُرخ ہوتا ہوا چہرہ اور اُس کے تھرتھراتے ہوئے اُبھار اپنے بہت قریب نظر آئے۔ کیونکہ عائشہ بہت قریب سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے جھکے جھکے اُس کی طرف ایک لمحہ کے لئے دیکھا۔ وہ میرے اس قدر قریب تھی کہ میں نے اس کے سانس کی آنچ اور

اُس کے حسن کی پگھلتی ہوئی لَو اپنے رخساروں پر محسوس کی۔ اُس کے گلابی ہونٹ ذرا سے کس گئے تھے اور بالکل منتظر تھے۔ ایسے میں میں نے سکینہ کو برآمدے کے اندر کے کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا۔ میں نے جلدی سے پتیوں کی جھری سے زرد گلاب کی کچی کلی کو نکالا اور سیدھا ہو کر کے زور سے دُور پھینک دیا۔

"بزدل!" عائشہ ناگن کی طرح پھنکاری۔ پھر سکینہ کو آتے دیکھ کر سنبھل گئی۔

میگی اور پام اور ماسٹر جی بھی تینوں باہر جا رہے تھے۔ مگر کلب کو نہیں۔ نالے پر سیر کرنے کے لئے۔ کچھ دنوں سے یہ اکٹھے سیر کرنے کے لیے نالے کو جاتے تھے۔ آج سردی بڑھتی ہوئی دیکھ کر میگی اپنے دبلے پتلے بدن میں جھری جھری محسوس کر کے کانپ اٹھی۔ اُس نے پام اور ماسٹر جی دونوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ٹھہرو! میں اندر سے اپنا اونی کوٹ پہن کے آتی ہوں ...."

"اونی کوٹ، موسمِ گرما کی رُت میں؟" پام نے طنز آمیز انداز میں سوال کیا۔

مگر میگی اُس کے سوال کا کوئی جواب نہ دے کر اندر چلی گئی۔

چند لمحوں تک تو پام چپ رہی اور اپنے دونوں کولہوں پر ہاتھ رکھ کر اِدھر اُدھر ڈولتی رہی۔ پھر اُس کی آنکھوں میں ایک شریر چمک نمودار ہوئی اور اُس نے سر کے اشارے سے ماسٹر متین احمد کو اپنے پیچھے آنے کے لئے کہا۔

ماسٹر متین احمد نے چند لمحوں کے لئے توقف کیا۔ بہت بے چین نظر آئے۔ اِدھر دیکھا اُدھر دیکھا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو پام کے پیچھے ہو لئے۔ پام نالے کی سمت جا رہی تھی۔ ماسٹر متین احمد کو ساتھ لے کر۔

چند لمحوں میں وہ دونوں نظر سے اوجھل ہو گئے۔ جب نظر سے اوجھل ہوئے تو میں نے

دیکھا کہ ماسٹر جی پام کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ پام نے اُن کے بازو کا سہارا لے لیا تھا۔ وہ بازو جواب تک صرف میگی کے لئے وقف تھا۔ اُن کے جانے کے بعد ہی میگی کچھ گنگناتی ہوئی اپنا ہلکا گہرے اونی کوٹ پہن کر باہر نکل آئی۔ جب اُس نے دیکھا کہ ماسٹر جی اور پام نہیں ہیں تو وہ ایکبارگی ٹھٹھک گئی۔ اُس کے چہرے کا رنگ ایک دم اُس کے کوٹ کی طرح گہرا ہو گیا۔ زیرِ لب ہونٹوں کی گنگناہٹ ایک دم رُک گئی۔ اُس نے اِدھر دیکھا اُدھر دیکھا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو سکینہ سے پوچھا۔

"یہ لوگ کہاں ہیں؟"

"چلے گئے"۔ سکینہ نے بے حس لہجے میں کہا۔

میگی کی ڈرتی ہوئی پتلیاں بڑی تیزی سے اِدھر اُدھر گھومیں۔ جیسے کوئی پرندہ اچانک زخمی ہو کر تڑپنے لگے۔ سکینہ ان آنکھوں کی اذیت کی تاب نہ لا سکی۔ بڑے غصے سے بولی۔

"میگی، تمہیں ہوا کیا ہے...؟" دیکھتی نہیں ہو، پام تم سے عمر میں کتنی کم ہے؟"

میگی نے ایک لمحے کے لئے ٹھٹھک کر سیدھا سکینہ کی آنکھوں میں دیکھا۔ پھر بڑی نخوت سے ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔

"عمر کم ہے تو کیا ہوا؟.... وہ میری طرح کنواری تو نہیں ہے!"

پھر مس میگی ایلیٹ، عمر اسی سال۔ ایک عورت۔ اپنی ایڑی پر گھوم گئی۔ اور ایک ناقابلِ تسخیر غرور سے سر اٹھاتے ہوئے برآمدے میں چلی گئیں — واپس اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ دروازہ بند ہو گیا۔ ہم دیکھتے ہی رہ گئے — یہ بھی سمجھ میں نہ آیا کہ ہنسیں یا روئیں؟

سکینہ ایک دم بہت سنجیدہ ہو گئی تھی۔ اُس نے اپنی آنکھیں ہم سے چرائی تھیں اور اب تیز تیز قدموں سے آگے چل رہی۔ اُن کے پیچھے پیچھے فاضل بھائی جلدی جلدی سے قدم

بڑھانے لگے۔

عائشہ نے میری طرف بڑے غور سے دیکھا۔

میں نے گلاب کی بیل سے ایک زرد کلی کو توڑ لیا اور اسے سونگھتے ہوئے بولا۔

"نو ہڈ پارٹنر!"

دس روپے کا نوٹ

میں آٹھ نومبر ۱۹۴۶ء میں ناسک شہر میں پیدا ہوا۔ لیکن مجھے وہاں رہنے کا بہت کم موقع ملا ہے۔ میں ایک آوارہ گرد سیلانی ہوں۔ گاؤں گاؤں، شہر شہر گھومتا ہوں اور سدا چکر میں رہتا ہوں۔

جہاں جاتا ہوں لوگ مجھے ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں اور مسکراتے ہوئے چہروں سے میرا استقبال کرتے ہیں اس دنیا میں میرا کوئی دشمن نہیں ہے سب دوست ہیں۔ سب مجھے دل سے چاہتے ہیں میں نے اپنی چھوٹی سی زندگی میں بہت کچھ دیکھا ہے۔ سیکھا ہے۔ کھویا ہے۔ لیکن اپنی زندگی کے ان گنت تجربوں کے باوجود ایک بات میں بے کھٹکے کہہ سکتا ہوں کہ اپنی چھوٹی سی زندگی میں میں نے جو شہرت اور مقبولیت حاصل کرلی ہے وہ بہت کم لوگوں کے حصے میں آئی ہے آج تک کسی بڑے سے بڑے سیاسی لیڈر یا فلم اسٹار کو بھی وہ شہرت

در مقبولیت نہیں ملی جو مجھے مل چکی ہے۔ بچہ بچہ مجھے جانتا ہے، پہچانتا ہے اور مجھ سے محبت کرتا ہے۔

میں روپے کا نوٹ ہوں۔

کئی ماہ تک میں مشہور فلم اسٹار شہزادی کے ڈرائنگ روم میں لکڑ بابا کی تصویر کے فریم کے گرد نوٹوں کے ہار میں ٹنگا رہا۔ شہزادی لکڑ بابا کو بہت مانتی تھی اور اس نے دس دس کے نوٹوں کو لے کر پانچ سو روپے کا ہار لکڑ بابا کی تصویر کے گرد لٹکا دیا تھا شہزادی کا سب سے چھوٹا بھائی (جو دراصل اس کا بھائی نہیں بیٹا تھا) گھر کا لاڈلا تھا۔ گھر کے لوگ اسے پیار سے منا کہتے تھے۔

یوں تو منا کو اس کی ماں اور شہزادی دونوں پاکٹ منی دیتے تھے مگر منا لاڈلے بچوں کی طرح بہت شاہ خرچ تھا اب اس نے اپنی ماں بہن کے علاوہ لکڑ بابا سے بھی روپیہ نکالنے کا طریقہ ایجاد کر لیا تھا وہ بہت ذہین بچہ تھا اور جب اس کی فضول خرچی کو روکنے کے لئے یا اسے سزا دینے کے لئے امی اور شہزادی اس کی پاکٹ منی روک دیتے یا پاکٹ منی جلد ختم ہو جاتی اور منا کو مزید رقم کی ضرورت پڑتی تو وہ سب کی نظریں بچا کر ایک کرسی پر اسٹول رکھ کر کسی نہ کسی طرح لکڑ بابا کی تصویر تک پہنچ جاتا اور ہاتھ جوڑ کر کہتا۔

"لکڑ بابا بھیل پوری کھانے کو جی چاہ رہا ہے اگر برا نہ مانو تو تمہارے ہار میں سے ایک روپیہ لے لوں"؟

"لے لوں!"

بس ایک روپیہ لوں گا۔ صرف ایک، اور پھر کبھی نہیں لوں گا۔"

اس پر منا کو ایسا محسوس ہوتا جیسے لکڑ بابا تصویر میں سے جھانک کر اس کی طرف دیکھ

مگر مسکرا رہے ہیں اور اسے ہار میں سے ایک روپیہ نکالنے کی اجازت دے دی ہے اس پر خاموش ہو کر ٹکڑو بابا کی تصویر کو چوم لیتا ہے اور ہار میں سے ایک روپیہ نکال کر چلا جاتا۔

مدتوں یہی عمل جاری رہا۔ کبھی بھیل پوری کے لئے۔ کبھی بارہ مصالحے کے لئے۔ کبھی آئس کریم کے لئے۔ کبھی غباروں کے لئے۔ کھلونوں کے لئے۔ دوستوں کو ترغ دینے کے لئے ۔۔۔۔۔۔ ایک روپے کے نوٹ ہار میں سے نکلتے رہے۔

شروع شروع میں تو پتہ نہیں چلا۔ پھر ہوتے ہوتے ہار خالی ہونا شروع ہوا۔ بیچ بیچ میں سے گنجا ہونے لگا۔ ایسا لگا جیسے ہار پر پت جھڑ کا موسم آچلا ہے ایک دن منا صاحب بین اس عالم میں پکڑے گئے جب وہ کرسی پر تپائی رکھ کر نوٹوں کے ہار میں سے مجھے نکال رہے تھے۔ شہزادی کو اس سے پہلے تو گھر کے نوکروں پر شبہ تھا لیکن جب ایک نوکر شہزادی کو جلدی سے بلا کر لایا اور انہیں منا صاحب کو دکھایا تو شہزادی نے منا کو کرسی سے نیچے گھسیٹ کر دو ہاتھ لگائے نوٹ اس کے ہاتھ سے چھین کر اپنے پرس میں ڈال لیا۔ بلکہ سارا ہار ہی نوچ کر اس نے اپنے پرس میں ڈال لیا۔

اس پر منا شہزادی کی گود میں لیٹا لیٹا ٹانگیں ہلا ہلا کر مچلنے لگا۔ زور زور سے چیخنے چلانے لگا تو شہزادی نے اسے اور مارا۔ اور مارا آتنا مارا کہ امی دوڑتی دوڑتی ڈرائنگ روم میں گھس آئیں اور بچے کو اس کی گود سے چھین کر غضب ناک آواز میں بولیں۔

ارے ۔۔۔۔ ارے ۔۔۔۔ ارے یہ کیا کرتی ہو؟ اپنی ہی کوکھ کے جائے پر اتنا ظلم ڈھاتی ہو۔ صرف دس روپوں کے لئے اپنے ہی بچے پر؟ تمہیں شرم نہیں آتی!"

کہنے کو تو امی جان نے غصے میں اتنا کہہ دیا۔ مگر کہتے کہتے انہوں نے اپنی غلطی محسوس کر کے دانتوں کے تلے انگلی داب لی۔ شہزادی نے بھی منہ پر انگلی رکھ کر جلدی سے اِدھر اُدھر

دیکھا۔ اتفاق سے اس وقت ڈرائنگ روم میں ماں بیٹی اور بچے کے علاوہ اور کوئی موجود نہ تھا شہزادی کی جان میں جان آئی۔ ماں شرمندہ ہو کے چپ تھیں۔ منا ان کی چھاتی میں دبکا ہوا منہ چھپائے ہوئے تھا سارے کمرے میں سناٹا تھا۔

یکایک منا نے سر اٹھا کے شہزادی کی طرف دیکھا اور سسکتے سسکتے کہا۔

"ہم کو دس روپے دے دو! نہیں تو ہم سب سے کہہ دیں گے۔ ہم امی کے بیٹے نہیں ہیں۔ ہم شہزادی کے بیٹے ہیں۔"

اپنی ماں سے دس روپے لے کر منا اپنی نئی طاقت کے احساس سے سرشار اپنی نانی کی گود سے اترا اور باہر بازار میں آئس کریم کھانے چلا گیا۔ اگر میں اس کی زندگی کا پہلا بلیک میل تھا تو کیا ہوا ابھی تو اس کی عمر صرف سات سال ہے۔

آئس کریم اینڈ ملک بار کی کاؤنٹر سے میں فیروز اور خانم کے ساتھ کرایا گیا جو ملک بار سے آئس کریم کھا کر نکل رہے تھے دکان سے باہر نکل کے خانم کو یاد آیا کہ ان کے علاقے میں وناسپتی گھی بھی بلیک میں چلا گیا ہے اس لئے انہوں نے قریب کے بنئے کی دکان سے وناسپتی گھی کا ایک ڈبہ خریدا۔ بنئے کی دکان سے مجھے مسز ایڈل جی کے ہمراہ کر دیا گیا۔ جس نے بنئے سے بہت سا سامان خریدا تھا مسز ایڈل جی نے مجھے ایک بساطی کے حوالے کر دیا۔ جس کی دکان سے انہوں نے اپنے ڈرائنگ روم کے لئے نئے پردوں کا کپڑا خریدا تھا اسی بساطی کی دکان پر ابھی منظور کلرک اپنی بیوی بتول کے ہمراہ سیلز کاؤنٹر پر کھڑا اپنے گھر میں ہونے والی پہلی خوشی کے سلسلے میں کچھ ضروری کپڑے خرید رہا تھا بچے کے پوتڑوں، فراکوں اور ننھی ننھی رنگدار ٹوپیوں کے لئے کپڑا۔ ان کے ساتھ میں شربت والے کی دکان پر آیا کیونکہ بتول کو پیاس لگ رہی تھی۔ شربت والے نے مجھے ایک ادھیڑ عمر کے آدمی کے سپرد کیا۔ جس نے اس کی دکان سے کیلے بعد دیگرے

شربت کے چار گلاس پیئے تھے اس ادھیڑ عمر کے آدمی نے دکان سے باہر نکل کر قریب کے دوا فروش سے سر درد کی گولیوں کا ایک پورا ڈبہ خریدا۔ اس ادھیڑ عمر کے آدمی کی صورت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ نہ صرف اسے سدا سر درد رہتا ہے بلکہ خود اس کی ذات دنیا کے لئے مستقل سر درد ہے۔ سر درد کی گولیاں خرید کے وہ ادھیڑ عمر کا آدمی ایک ٹیکسی پر سوار ہوا اور اپنی منزل پر پہنچ کر اس نے مجھے ٹیکسی والے کے حوالے کیا۔ ٹیکسی والے نے پٹرول پمپ والے کو دیا۔ پٹرول پمپ والے نے ایک ایسے جوڑے کو دیا۔ جنھوں نے پہلی بار موٹر خریدی تھی اور اس میں بیٹھ کر سینما جا رہے تھے۔ سینما دیکھ کر میں ان کے ساتھ لوٹ رہا تھا کہ پھر ایک پٹرول پمپ پر پہنچا دیا گیا۔ جہاں سے میں غلام علی موٹر میکینک کی جیب میں پہنچا۔ غلام علی مجھے لے کر بازار کے شدد حمام والے کے یہاں چلا گیا۔ حمام والے نے مجھے ایک حجام کے سپرد کیا۔ حجام نے کبابیئے کے سپرد کیا۔ کبابیئے نے کرائے میں مجھے کیفے دلپسند کے مالک کے حوالے کیا جس کی دکان کے باہر ایک کونے میں وہ کباب کی دکان لگاتا تھا۔ کیفے دلپسند کے یہاں سے ماسٹر برکاتنر ا ٹیلر کی جیب میں آیا۔ جس نے دوسرے دن مجھے سیٹھ منگھارام کے حوالے کیا جس نے ماسٹر برکاتنرا کی دکان سے ایک سوٹ سلوایا تھا۔ سیٹھ منگھارام کی کلب میں۔ ایک بہت بڑی کیوریو شاپ تھی۔ وہاں جہاں بڑے بڑے امیر لوگ اور غیر ملکی سیاح نوادر خریدنے آتے تھے۔ منگھارام ایسی ایسی نادر چیزیں اپنی دکان میں جمع کرکے رکھتا ہے۔ ہانگ کانگ سے لے کر نیویارک تک اس کے مال کی کھپت تھی شہر کے باہر کئی علاقوں میں اس نے چھوٹی چھوٹی فیکٹریاں قائم کر رکھی تھیں جہاں نہایت راز داری سے پرانا مال تیار ہوتا تھا ایک فیکٹری میں ساتویں صدی کے بدھ کے بت بنائے جاتے تھے ایک فیکٹری میں دو صدی قبل از مسیح شیوجی کے بت بنانے کیلئے وقف تھی ایک فیکٹری میں صرف وہ سامان تیار ہوتا تھا جو موہن جودارو اور ہڑپہ کی کھدائیوں

سے نکلا ایک فیکٹری صرف مغل عہد کے نوادرات مینوفیکچر کرتی تھی نورجہاں کا عطردان، بابر کی تلوار، جہانگیر کا خنجر، جودھا بائی کی پوجا کی تھالی، اکبر کی انگوٹھی، اورنگزیب کا اگالدان اور ممتاز محل کا پاندان، سب کچھ سیٹھ منگھارام کے یہاں ملتا تھا۔ ایک فیکٹری۔ پرانی کھائی ہوئی لکڑی کے تاریخی سامان تیار کرتی تھی یعنی اشوک کی خواب گاہ کا دروازہ، چندرگپت کے پلنگ کا پایہ۔ مہارانی پدمنی کے آئینے کا چوبی فریم۔ کالی داس کی چھڑی گرو وشوامتر کی کھڑاویں۔ ایک دفعہ تو منگھارام کا ایک سیلزمین ایک یورپی سیاح کو چانکیہ رشی کی عینک تک بیچ دینے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ بارہ سو روپے میں اور سیٹھ منگھارام نے اپنے ملازم کی کارکردگی پر خوش ہوکر سو روپے انعام دیا تھا۔

کل رات سیٹھ نے دکان کے گلے میں سے کچھ رقم ادھار لی تھی حساب پورا کرنے کے لیے اس نے اپنا بٹوہ کھولا اور رقم برابر کرکے اس نے مجھے بھی نوٹوں میں ڈال کر کل رقم ایک ملازم کے حوالے کرکے کہا کہ وہ اسے کل کے حساب میں جمع کرکے بینک میں رقم ڈال آئے۔ سیٹھ کے ملازم نے رقم لے کر احتیاط سے سب نوٹوں کو گنا۔ مجھے دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ کیونکہ متواتر استعمال سے اور پانچ سال ایک گندی ہانڈی میں رہ کر اتنا کثیف میلا اور خستہ ہوچکا تھا کہ ہر ایک کی نگاہوں میں چبھنے لگتا تھا۔

ملازم نے مجھے غور سے دیکھا یہ وہی ملازم تھا جو گرو چانکیہ کی عینک بیچ چکا تھا۔ دیکھنے میں اب اس قدر پرانا ہوچکا تھا کہ اگر مجھ پر یہ انگریزی حروف چھپے ہوئے نہ ہوتے تو وہی ملازم مجھے محمد تغلق کے زمانے کا نوٹ سمجھ کر بیچنے پر تیار ہو جاتا۔ اس پر بھی وہ مجھے دیر تک الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ اور میری سمجھ میں نہ آیا کہ مجھ میں ایسے کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں جس کی وجہ سے وہ مجھے اس قدر غور سے دیکھ رہا تھا دس کا نوٹ ہی تو ہوں۔

بالآخر وہ ملازم سیٹھ کے پاس پہنچا۔ سیٹھ کے سامنے میز پر رکھ کر بولا۔

"ذرا اس نوٹ کو غور سے دیکھئے۔"

سیٹھ نے مجھ پر سرسری سی ایک نگاہ ڈال کر کہا۔

"کیا دیکھوں! دس کا نوٹ ہی ہے۔ کیا تمہیں سو کا دکھائی دیتا ہے؟" سیٹھ نے ملازم پر ایک طنز آمیز نگاہ ڈال کے کہا۔

"ذرا غور سے دیکھئے!" ملازم نے پھر اصرار کیا "انڈیا کی ڈی الٹی چھپ گئی ہے۔"

سیٹھ نے چونک کر دیکھا۔ واقعی میرے ماتھے پر جہاں RESERVE BANK OF INDIA لکھا تھا وہاں انڈیا کا لفظ یوں چھپا تھا... INαIA

"ارے واقعی D کی جگہ ◯ ہے۔ یعنی الٹی ڈی۔"

اور ملازم نے مجھے بالکل سیٹھ کی آنکھوں کے نیچے سرکاتے ہوئے کہا۔ دیکھئے جہاں لکھا ہے I Promise to pay bearer on demand ——— وہاں لفظ PROMISE کی E (ای) غائب ہے۔"

"واقعی!" سیٹھ نے غور سے مجھے پرکھتے ہوئے کہا "واقعی! یہ تو..... یہ تو ایک نایاب نوٹ ہے۔" منگھا رام کا دل خوشی سے دھڑکنے لگا اس کی ڈی الٹی ہے اور ای بالکل غائب ہے۔"

یکایک سیٹھ کے دل میں ایک خیال گزرا۔ اس نے ملازم کے منہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کہیں جعلی تو نہیں ہے؟"

ملازم چپ رہا۔

کچھ سوچ کر سیٹھ بولا "تم اس نوٹ کو یہیں چھوڑ جاؤ۔ میں سب معلوم کرتا ہوں"
میری جگہ اس نے ملازم کو دس کا دوسرا نوٹ دے کر بینک بھیج دیا۔ وہ خود کرنسی آفس فون کر مجھے اپنی جیب میں ڈال کر چلا گیا۔ پانچ چھ دن میں سیٹھ منگھارام کے پاس رہا۔ وہ روز مجھے بڑی احتیاط سے اپنی تجوری میں بند کر دیتا تھا سب پوچھ پاچھ کرنے کے بعد جب سیٹھ نے اپنا اطمینان کر لیا تو اس نے میرے لئے چاندی کا ایک فریم بنوایا اور اس میں جڑوا کر اس ملازم سے کہنے لگا۔

"میں نے سب معلوم کر لیا ہے یہ نوٹ بالکل اصلی ہے ناسک سے شائع ہوا ہے مگر ڈائی غلط ہو گئی اور غلط چھپ گیا اس کے سیریل نمبر کے دوسرے تمام نوٹ غلط چھپنے کی وجہ سے تلف کر دیئے گئے۔ مگر کسی کارکن کی غلطی کی وجہ سے یہ نوٹ کرنسی میں آ گیا۔ اپنی طرز کا واحد نوٹ ہے یہ ہندوستان بھر میں بالکل نایاب ہے۔ میں اخباروں میں اس کا اشتہار دیتا ہوں اور اگلے ماہ کے نیلام میں اس کی قیمت لگانے کی کوشش کروں گا۔ اور اس کی جو کچھ قیمت حاصل ہو گی اس کا پانچ فیصد تمہیں دوں گا کیونکہ سب سے پہلے تم نے اس نوٹ کی نایاب خوبی کو پہچانا ہے۔

ملازم نے جھک کر شکریہ ادا کیا اتنے میں سیٹھ کی نئی اسٹینو چند کاغذات ٹائپ کر کے حاضر ہوئی۔

سیٹھ منگھارام پہلا خط پڑھتے ہی غصے سے بھڑک گیا "ہیجے کی اتنی غلطیاں OF COURSE اس طرح لکھا جاتا ہے؟ WE PROMISED TO PAY کا PROMISED "ای" غائب ہے اور ڈالر کا "اے" ..... A کدھر گیا؟ کیا گھر سے ناشتہ کر کے نہیں آئی ہو؟ جو یہاں لفظوں کے حروف کھانے شروع کر دیتی ہو؟ ہماری فرم نیویارک تک بزنس

کرتی ہے۔ ایسی غلطیاں ہجے کی یہاں نہیں چلیں گی۔ اکاؤنٹنٹ سے اپنا حساب چکتا کرو اور جاؤ۔!"

سیٹھ نے کانپتی ہوئی نئی اسٹینو کے ہاتھ میں ٹائپ شدہ خط دستخط کئے بغیر واپس کرتے ہوئے کہا۔

اس دن نیلام میں بڑی بھیڑ تھی جس دن میری بولی لگائی گئی۔ دور دور سے نادر اشیاء کو خریدنے والے آئے تھے اور بڑی، حیرت کس قدر شبہ اور شوق سے مجھے دیکھتے رہے تھے مگر سیٹھ منگھارام نے شبہ کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تھی دمکتے ہوئے چاندی کے فریم میں سب کی نگاہوں کے سامنے میں موجود تھا چاندی کے فریم کے نیچے ناسک پرنٹری کا ایک سرکاری کاغذ ہوا میں ہولے ہولے ہل رہا تھا۔ جس پر صاف الفاظ میں لکھا تھا کہ میں کوئی جعلی نوٹ نہیں ہوں کوئی جعلی نوٹ نہیں ہوں اصلی نوٹ ہوں میری تاریخ اشاعت بھی درج تھی شبہے کا کوئی امکان نہ تھا۔

بولی شروع ہوئی۔

سیٹھ منگھارام نے چلا کر کہا۔ "دس کے نوٹ کی قیمت ایک ہزار روپے۔"

"دو ہزار روپے۔"

"تین ہزار روپے۔"

"تین ہزار پانسو۔"

"تین ہزار سات سو۔"

"تین ہزار سات سو، تین ہزار سات سو۔"

"ساڑھے چار ہزار۔"

"پانچ ہزار۔"

میرا سر چکرانے لگا۔ کیسی عجیب وغریب دنیا ہے کل تک میں محض دس کا نوٹ تھا آج میری قیمت پانچ ہزار روپے ہے مجھے وہ ہزاروں آنکھیں یاد آگئیں جنہوں نے ابتک مجھے دیکھا تھا اور میرے ماتھے پر لکھے ہوئے لفظوں پر بھروسہ کیا تھا۔

I PROMISE TO PAY THE BEARER ON DEMOND THE SUM OF RUPEES TEN AT ANY OFFICE OF ISSUE

"چھ ہزار روپے۔"

"سات ہزار روپے۔"

"سات ہزار آٹھ سو۔"

"سات ہزار آٹھ سو۔ سات ہزار آٹھ سو۔۔۔۔۔ ایک!

"آٹھ ہزار۔ نو ہزار۔ دس ہزار۔"

دس ہزار!؟ میں حیرت سے چونک پڑا۔ کیا میری قیمت واقعی دس ہزار ہے! کل تک میں دس روپے کا نوٹ تھا۔ آج قیمت دس ہزار کیسے ہوگئی؟ وہی میں ہوں۔ وہی کاغذ ہے وہی مٹھیہ ہے۔

"بارہ ہزار۔"

"بارہ ہزار۔۔۔؟ بارہ ہزار میں ایک لڑکی کی شادی ہوسکتی ہے"۔ مگر بولی بڑھتی گئی

"تیرہ ہزار۔"

"تیرہ ہزار چھ سو۔"

"تیرہ ہزار نو سو۔"

"چودہ ہزار ۔"

"اٹھارہ ہزار ۔" ـــ ایک دبلا پتلا نوجوان کانچ کے بڑے بڑے محدب شیشوں والی عینک چڑھائے ہوئے بول اٹھا ۔

"اٹھارہ ہزار ؟ ..... میں نے اس زرد رو تقریباً گرم خوردہ نوجوان کی بوسیدہ صحت والے جسم کی طرف دیکھا اب میری قیمت اٹھارہ ہزار ہے ۔ کل تک میں وناسپتی کا ایک ڈبہ بھی نہیں خرید سکتا تھا اور آج ایک موٹر خرید سکتا ہوں ..... اٹھارہ ہزار ..... ؟

"اٹھارہ ہزار ..... اٹھارہ ہزار ..... سیٹھ منگھارام اس زرد رو نوجوان کی طرف دیکھ کر چلایا ۔ وہ اسے پہچانتا تھا وہ زرد رو نوجوان ملک کے مشہور کروڑ پتی سیٹھ چمن لال کا بیٹا تھا مگن لال کو نوادرات جمع کرنے کا بے حد شوق تھا اس نے اپنے عالی شان گھر میں ایک عجائب خانہ بنا رکھا تھا جس میں وہ دنیا بھر کے کیوریو لا کے جمع کرتا تھا ۔ محدب شیشوں کے پیچھے اس کی ننھی سی آنکھیں گہرے تجسس ۔ شوق اور اضطراب سے چمکتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں وہ نوادرات کا دیوانہ تھا ۔

اب سب لوگ پیچھے ہٹ گئے تھے مگن لال کا مقابلہ ایک امریکی سیاح سے تھا ۔ چارلس ڈوئسٹل نیویارک میں سالسٹر تھا ۔ ایک کامیاب وکیل ۔

دنیا کے امیر ترین ملک کا شہری ـــ وہ پیچھے نہیں ہٹے گا .....

"بیس ہزار !

" بائیس ہزار ! " مگن لال بولا ۔

" پچیس ہزار !! " ڈوئسٹل نے ایک سگریٹ سلگاتے ہوئے بڑی لاپرواہی سے کہا

" ستائیس ہزار !! " مگن لال اپنی باریک آواز میں اتنی زور سے چلایا کہ مجمع میں ہر ایک

کے چہرے پر مسکراہٹ جھلک اٹھی۔

"تیس ہزار!!" ڈوئٹل اپنی ٹھنڈی بھاری آواز میں بولا۔

"تیس ہزار؟ میرے ہوش و حواس جواب دینے لگے۔ آخر میں نے کیا کیا تھا؟ کون سا تیر مارا تھا؟ کون سی ایسی کڑی محنت کی تھی؟ کس کی بھلائی کے لئے دن رات ایک کر دیا تھا؟ جس کے انعام میں میری قیمت اس قدر بڑھا دی گئی تھی۔ مگر یہ تو ایک عجیب و غریب نامعقول ٹیڑھا سماج ہے یہاں ہر خوبی خامی ہے۔ یہاں اگر آپ سیدھے سچے اور کھرے ہیں، تو آپ کی قیمت دس کے نوٹ سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر آپ کی ڈی الٹی ہے اور اس ای غائب ہے تو آپ کی قیمت تیس ہزار بھی ہو سکتی ہے۔ نوٹ کے ہجے غلط ہوں تو وہ سب سے قیمتی ہے آدمی کے ہجے غلط ہوں تو دفتر سے باہر نکال دیا جاتا ہے۔ سیٹھ منگھا رام کی اسٹینو کی طرح......

"بتیس ہزار۔!" مگن لال غصے سے چلایا۔

چارلس ڈوئٹل مسکرایا۔ اس کا مقابلہ ایک دیوانے سے تھا یکایک اس نیلام سے اس کی ساری دلچسپی غائب ہو گئی اور وہ پلٹ کر شو کے کسی پرانے بت کو دیکھنے لگا۔ چند منٹ تک سیٹھ منگھا رام اسے متوجہ کرنے کے لئے چلاتا رہا اور وہ میری خوبیوں کو بڑھا چڑھا کے بیان کرتا رہا مگر اس امریکی سیاح کا دل مطلق نہ پسیجا۔ آخر اس نے مجھے بتیس ہزار روپے کے عوض مگن لال کے حوالے کر دیا۔

کانپور میں لوہے کی ایک بہت بڑی فونڈری تھی اور اب وہ گوالیار میں ریان کا ایک

بہت بڑا کارخانہ کھولنے میں مصروف تھا اسے ایک نئی بات کا غم تھا۔ اس کے بیٹے کے کوئی اولاد نہ تھی مگن لال ابھی تک لاولد تھا اور مگن لال چونی لال کا اکلوتا بیٹا تھا۔

مگن لال اولاد پیدا کرنے کے لئے تقریباً ناقابل تھا۔ تقریباً اس لئے کہ اس کے سارے جذبات مرد کے سے تھے۔ وہ عشق کی آگ اور اس کی حدت کو ایک مرد کی طرح محسوس کرتا تھا۔ مگر اس کا جسم اس کا ساتھ نہ دیتا تھا۔ وہ محسوس کرتا کہ تخلیق کا شعلہ سا اس کی روح میں لپک رہا ہے مگر اس کی روح اور اس کے شدید احساسات کے گرد جسم ایک، ٹھنڈے من اور برفیلے خول کی طرح اس کے گرد لپٹا ہوا ہے اور یہ برف جو کسی طرح پگھلتی نہیں ہے اس کے بھڑکتے ہوئے خوبصورت جذبات کو ناکام بنا دیتی اور وہ ایک زخم کھائے ہوئے جانور کی طرح اپنی روح کے شدید احساسات اور اپنے جسم کے پر ہول سناٹے کی آویزش سے چیخ اٹھتا۔ ٹھنڈے جسم کے ساتھ اگر روح بھی ٹھنڈی ہو تو کوئی مسئلہ ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن فطرت نے اسے ایک شعلہ بجان روح دے کر اور اس کے گرد برف کا ایک دائرہ کھینچ کر اس سے شدید بے انصافی کی تھی کیونکہ مگن لال کی حسن پرستی انتہا کو پہنچ چکی تھی، خوبصورت عورت کو دیکھ کر اس کا ذہنی رد عمل وہی ہوتا تھا جو کسی مکمل مرد کا ہوتا ہے۔

وہ اس کے خطرناک خم، اس کی نگاہ کی آتش نوائی اور اس کے ہونٹوں کی بولتی ہوئی دعوت سے اسی قدر متاثر ہوتا تھا۔ جس قدر کوئی بھی صحت مند اور تندرست مرد متاثر ہو سکتا ہے۔ اپنے افتاں و خیزاں جذبات کے سہارے ڈولتا ہوا جب وہ کسی عورت کے قریب چلا جاتا اور اسے چھونے کی کوشش کرتا تو نہ صرف اس عورت کو بلکہ خود اسے بھی معلوم ہو جاتا کہ یہ کسی مرد کی انگلیاں نہیں ہیں جو کسی عورت کو چھو رہی ہیں برف کی قلمیں ہیں جن کے لمس سے عورت کے بدن میں بیزاری اور نفرت کی لہریں دوڑ رہی ہیں اور

وہ کانپ کر پیچھے ہٹ جاتا۔ دیواروں سے ٹکریں مارتا۔ دو دفعہ اس نے خودکشی بھی کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر ناکام رہا۔

پے درپے ناکامیوں کے بعد اب اس نے اپنی روح کی شعلہ سامانی کو تحلیل کرنے کا ایک راستہ ڈھونڈھ لیا تھا اس نے اپنی شدید جنسی حس کو ایک شدید جمالیاتی حس میں ڈھالنے کی کوشش کی تھی۔ عورت کا جسم اس کا نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر خوبصورت تصویریں تو اس کی ہو سکتی تھیں اور سنگِ مرمر کے پرانے بت جن پر وینیس کا شبہ ہوتا تھا۔ کانسی کے نٹ راج کا منجمد خرام اور وہ شمعدان جو مغلوں کے حرم میں حسن و عشق کی لو کو تیز کرتے تھے ان اشیأ اور کیوریوز پر وہ دائمی قبضہ کر سکتا تھا اور ان اشیاء کا حسن ایسا تھا جو اس کی ٹھنڈی انگلیوں کے لمس سے بیزار نہیں ہو سکتا تھا وہ ایک کروڑپتی کا بیٹا تھا اور اس کی جائیداد کا واحد وارث تھا۔ اب اگر وہ خوبصورت عورت کا حرم نہیں سجا سکتا تھا تو خوبصورت چیزوں کا ایک عجائب خانہ کھول سکتا تھا اور یہی اس نے کیا۔ اس نے اپنے محل نما گھر کا ایک وسیع حصہ ان حسین وجمیل نوادر کو رکھنے کے لئے وقف کر دیا۔ جو وہ دنیا کے مختلف حصوں سے خرید کر جمع کرتا تھا ہوتے ہوتے اس کا یہ شوق بڑھتا گیا اور اب وہ ان نوادر کے خریدنے رکھنے سنبھالنے اور دوسروں کو دکھانے میں ایک لذتِ معکوس سی محسوس کرتا تھا اب بھی اس کی بیکراں روح کا کرب اپنی جگہ موجود تھا مگر اب گاہے گاہے ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے کسی نے اس کے زخم پر پھاہا رکھ دیا ہو۔

مگر اس کا باپ ایک عملی آدمی تھا اتنا اس کے لئے کافی نہیں تھا یہ کہ اس کے بیٹے کے مرنے کے بعد اس کی کروڑوں کی جائیداد دوسرے لوگوں میں بٹ جائے گی اس کا خیال ہی اس کے لئے سوہانِ روح تھا اس نے اپنے بیٹے کو ٹھیک کرنے کے لئے

طرح طرح کے جتن کیے۔ طرح طرح کے علاج کیے۔ چار بار اسے یورپ لے گیا۔ جدید سے جدید طریقے آزماتے ہوئے اس نے لاکھوں پھونک ڈالے انہیں میں ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ مگن لال کی شادی کسی حسین لڑکی سے کر دی جائے۔ مگن لال کے بار بار منع کرنے پر چونی لال نے اپنے بیٹے کی شادی ایک غریب گھرانے کی مگر انتہائی خوبصورت لڑکی سے کر دی۔

رسنا اس کا نام تھا۔ شباب کا رس اس کی رگوں میں دوڑتا نہیں تھا۔ کھولتا تھا وہ تند و تیز لاوے کی بنی ہوئی معلوم ہوتی تھی اس کے جسم میں بپھرے ہوئے سمندر کی لہروں کا خرام تھا۔ اس کی نگاہوں میں بجلی کا کوندا تھا اور انگلیوں میں آگ کی لپٹ مگن لال اسے دیکھ کر دیوانہ ہو گیا۔ یکایک اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ رسنا کو اپنی باہنوں میں لے کر مکمل مرد بن جائے گا۔

پھر وہ بجھ سا گیا۔ رسنا چند ماہ تو اپنے کھولتے ہوئے جذبات میں کسمساتی رہی۔ ٹوٹتی رہی اور ٹوٹ کر بنتی رہی پھر وہ یکایک پاگل ہو گئی دو سال تک پاگل رہی۔ پھر جب اچھی ہوئی تو وہ بھی بجھی سی گئی اس کے سسر نے اس محل نما گھر میں اپنی بہو کے لئے ایک مندر بنوا دیا تھا۔ جہاں وہ اکثر اکیلے میں پوجا کر کے اپنا دل بہلایا کرتی تھی اس کی آواز میں ایک عجیب کرب آمیز سنگیت کا رس اتر آیا تھا گھنٹوں وہ رادھا کرشن کی مورتیوں کے سامنے بیٹھی اپنے چھوٹے سے مندر میں بھجن گایا کرتی اور بھجن گاتے گاتے ایک عجیب محویت کے عالم میں بے ہوش ہو جایا کرتی۔ وہ ایک غریب گھر کی لڑکی تھی مگر اسے یہاں زندگی کی ہر آسائش میسر تھی۔ دو گورنیس اسے بہترین تعلیم اور مغربی آداب سکھانے پر مامور کی گئی تھی نوکروں کا ایک لمبا چوڑا عملہ تھا جو دن رات اس کی ہر خواہش کو چٹکیوں میں پورا کرنے کے لئے کوشاں رہتا تھا اس پر بھی کئی بار رسنا کا دل یہاں سے بھاگ جانے کو چاہا مگر سونے کی زنجیریں بہت خوبصورت

تھیں۔

رسنا کو شدید طور پر چاہنے کے باوجود اب مگن لال نے اس سے الگ رہنا سیکھ لیا تھا کیونکہ ساتھ رہنے میں شدید کوفت ہوتی تھی۔ ایسا لگتا جیسے جسم و جان کے ریشے ریشے ٹوٹ جائیں گے۔ وہ اپنے وقت کا زیادہ حصہ اپنے کیوریوز کے ساتھ صرف کرتا تھا۔ ان اشیاء کے ساتھ اس کا ملنا جلنا اس قدر بڑھ گیا تھا کہ اکثر اوقات اکیلے میں وہ ان سے گفتگو تک کرنے لگتا اور اسے محسوس ہوتا کہ تصویریں بھی بولتی ہیں اور سنگِ مرمر کے یونانی صنم اس سے باتیں بھی کر سکتے ہیں اب وہ محل کے اس حصے میں بہت کم جاتا تھا جہاں رسنا رہتی تھی صرف دوپہر کے کھانے پر وہ ملتی تھی اور رات کے کھانے پر، اور یہ دونوں اوقات بھی اس کے لئے سوہانِ روح بن جاتے تھے مگر وہ مجبور تھا پتا جی کا حکم تھا اور پھر نوکروں کے سامنے دنیا داری بھی برتنا ضروری ہے۔

جس دن مگن لال نے مجھے خریدا وہ اپنی غیر متوقع کامیابی پر اس قدر خوش ہوا کہ یہ خوش خبری رسنا کو سنائے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ مجھے ایک نوزائیدہ بچے کی طرح اپنے ہاتھوں میں تھامے رسنا کے بیڈ روم میں چلا گیا جو اب دوپہر کی نیند لے کر سنگھار میز کے سامنے اپنے کھلے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی بل کھاتے ہوئے آراستہ بال جو کمر تک جاتے تھے کنگھی اور رسنا کے بالوں کے ملے جلے لمس سے لہراتی ہوئی ناگوں کی طرح بیدار ہو رہے تھے۔

رسنا اسے یوں غیر متوقع طور پر اپنے بیڈ روم میں آتے دیکھ کر چونک پڑی مگن لال بے حد خوش ہو کر اس کے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔

"دیکھو! میں نے کیا خریدا ہے؟" وہ بچوں کی طرح چلا پڑا۔

رسنا نے مجھے دیکھ کر کہا "یہ تو دس روپے کا ایک نوٹ ہے۔"

"ہاں ہے تو دس روپے کا۔ مگر میں نے اسے تیس ہزار روپے میں خریدا ہے"

"ایسے باؤلے پن کی باتیں تم اکثر کرتے رہتے ہو"

"یہ باؤلا پن نہیں ہے یہ کوئی معمولی، عام، دس روپے کا بازاری نوٹ نہیں ہے یہ ایک خاص نوٹ ہے۔ نایاب نوٹ ہے اس نوٹ کا ثانی سارے ہندوستان میں نہیں ہے۔ بلکہ شاید ساری دنیا میں نہیں ہے آج دوپہر میں نے نیویارک میں ایک ڈیلر کو ٹیلیفون کیا تھا وہ اس نوٹ کے عوض ایک لاکھ ڈالر دینے کو تیار ہے۔

"آخر اس نوٹ میں ہے کیا؟" رسنا بڑی بے زاری سے میرے چاندی کے فریم کو دیکھنے لگی۔ اور کانچ پر ہاتھ پھیر کر اور مجھ پر ایک سرسری سی نگاہ ڈال کر سر اوپر اٹھا کے اپنے شوہر کی طرف دیکھنے لگی، استفہامیہ نگاہ سے۔

"ذرا غور سے دیکھو! انڈیا کی ڈی الٹی چھپ گئی ہے اور اس کی ای غائب ہے" گمن لال نے اسے بتایا۔

اب رسنا نے غور سے مجھے دیکھا پھر خاموشی سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا" اگر نوٹ کی ڈی الٹی ہے اور ای غائب ہے تو کیا ہوا اس کی نگاہیں کہہ رہی تھیں تمہارے جسم کی ای بھی تو غائب ہے اور ڈی الٹی ہے۔ پھر میں کیا کروں؟

اس دس روپے کے نوٹ کے جسے میں نے تیس ہزار میں خریدا ہے آج ایک لاکھ ڈالر مل رہے ہیں یہ دنیا کا سب سے قیمتی نوٹ ہے۔ آج تمہاری سالگرہ ہے اس موقع پر یہ نوٹ تمہیں تحفے میں دیتا ہوں۔"

رسنا نے مجھے دیکھا۔ سنگھار میز کے لمبے آئینے میں اپنے بالوں کو اپنی کمر کے نازک خم تک لہراتے دیکھا۔ کمرے کے وسط میں خوبصورت ریشمی چادروں سے سجے ڈبل بیڈ کی طرف دیکھا

پھر دلی جلن اور کھولن کی ایک لہر تڑپتی ہوئی اس کے گلابی گالوں تک آئی اور الاؤ اس کی آنکھوں میں چمکنے لگا اور اس نے مجھے زور سے اٹھا کے فرش پر پٹخ دیا۔ چاندی کا فریم تو نہ ٹوٹا ـــــ لیکن کانچ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔

وہ شعلہ بار نگاہوں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھ رہی تھی اس کی نگاہوں کی نفرت کی کاٹ مگن لال کے دل تک اتر گئی ایک لمحے کے لئے وہ ضرور بھونچکا رہ گیا تھا پھر اس نے آہستہ سے سر جھکا لیا۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس نے چاندی کے فریم کو اٹھا لیا جس میں وہ جڑا ہوا تھا اور مجھے لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

رشنا نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ ناخنوں سے نوچ نوچ کر اس نے اپنے سارے کپڑے پھاڑ ڈالے اور ماہیٔ بے آب کی طرح فرش پر لوٹنے لگی اس کا سارا بدن جل رہا تھا اور ہلکی ہلکی چیخیں اس کے ہونٹوں سے نکل رہی تھیں یہ چیخیں جو اس کے ان چھوئے بدن کی کراہیں تھیں۔

پھر اس نے سنگھار میز سے یوڈی کلون کی ایک بوتل اٹھائی جس کے منہ پر ریشمی ڈوریوں میں بند ربڑ کا فوارہ لگا ہوا تھا ربڑ دبا دبا کر وہ یوڈی کلون کی پھوار اپنے منہ پر، اپنی گردن پر، اپنی چھاتیوں پر اپنے جسم کے مختلف حصّوں پر ڈالنے لگی۔ جہاں یوڈی کلون کی پھوار پڑتی تھی جسم ٹھنڈا ہو جاتا تھا۔

ان ہی دنوں میں ایک انگریز ڈاکٹر ولیم رشر شہر میں وارد ہوا۔ وہ نفسیاتی طریقے سے علاج کرتا تھا پورے یورپ میں اس کے نئے طریقۂ علاج کی دھوم تھی وہ یہاں تین ماہ کے لئے آیا تھا چونی لال نے اپنے بیٹے اور بہو کو اسے دکھایا ولیم رشر کے پاس ڈاکٹری کی کوئی رسمی ڈگری نہیں تھی۔ اس کے علاج کا طریقہ بھی الوکھا تھا اور عجیب و غریب تھا مگر کئی پرانے

مریض حیرت انگیز طریقے سے اس نے ٹھیک کر دیئے تھے وہ صرف بڑے بڑے لکھپتی گھرانوں کا علاج کرتا تھا۔ کیونکہ اس کی پہلی فیس ہی ۵۰ ہزار روپے تھی ظاہر ہے اتنی بڑی فیس تو کوئی ہما شما ادا نہیں کر سکتا ہے۔

مگن لال اور رسنا کے طبی معائنے کے بعد سیٹھ چونی لال اور ولیم رتھر میں دیر تک باتیں ہوئیں کیا باتیں ہوئیں؟ یہ کوئی نہیں جانتا۔ مگر بات چیت کے بعد ولیم رتھر پھر مگن لال سے ملنے کے لئے اس کے عجائب گھر میں گیا۔ مگن لال سے اس نے اس کا عجائب گھر دیکھنے کی فرمائش کی۔

دیر تک مگن لال اسے اپنے عجائب گھر کے نوادر دکھاتا رہا۔ کویت کی کھدائیوں سے دستیاب کئے گئے نامعلوم بت گروں کے حسین مجسمے زہرہ کے مجسمے، ایفروڈائتی کے مجسمے، اہرام مصر سے چرائے ہوئے فراعین کے زمانے کی ممیاں اور ان کے زیورات، مصری کاہنوں کے گلے کے مقدس ہار۔ بھارت ناٹم ناچتی ہوئی رقاصہ کا بت، کانسی کا اور گیارہویں صدی کی دریافت، سسلی کے بنے خنجر اور چاندی کے فریم میں جڑا ہوا چاندی کا ایک نوٹ جس کی قیمت آج ایک لاکھ ڈالر تک پہنچ چکی ہے۔

مگن لال کا خیال تھا کہ ڈاکٹر کو ان نوادر کے سلسلے میں زیادہ واقفیت نہ ہو گی مگر لمبے تڑنگے، مضبوط اور بے داغ جلد والے مسکراتے ہوئے ڈاکٹر رتھر کی معلومات بے حد وسیع اور جامع ثابت ہوئیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے آثار قدیمہ کے بارے میں وہ خود کئی سال تک ریسرچ کرتا رہا ہے۔ مگن لال کو اس کی معلومات پر بڑی حیرت ہوئی۔

ڈیڑھ دو گھنٹے عجائب گھر میں گھومنے کے بعد مگن لال تھک گیا۔ وہ جلدی تھک جاتا تھا۔ دوسرے موقعوں پر وہ اس کام کے لئے دو پہیوں والی ایک کرسی کا استعمال کرتا۔ مگر آج

اس مغربی ڈاکٹر کے سامنے اس نے خود وہیل کرسی پر بیٹھ کر عجائب گھر دکھانا مناسب نہ سمجھا۔
عجائب گھر دیکھ کر وہ دونوں مغربی کونے کے ایک آرام دہ کیبن میں آ گئے۔ جو مضبوط کانچ کا بنا ہوا تھا جس کی ایک دیوار پر میں چاندی کے فریم میں ٹنگا ہوا تھا یہ کیبن گمن لال کا ایک طرح کا دفتر تھا اس کے سوچ بچار کا کمرہ تھا یہیں پر وہ دوپہر میں ایک کونے میں پڑے ہوئے دیوان پر لیٹ کر آرام کر لیتا تھا۔

اس کیبن میں پہنچ کر گمن لال نے ایک سگریٹ سلگایا۔ ڈاکٹر نے اپنا سگار سلگایا اور چند لمحوں کے لئے خاموشی طاری ہو گئی۔

پھر ڈاکٹر بولا "میرا خیال ہے تمہیں بیماری نہیں ہے"

"ایں" گمن لال حیرت سے چونک کر تقریباً کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"بیٹھو بیٹھو.....!" ولیم رشر کی نیلی اجلی صاف آنکھوں میں ہمدردی کی ایک جھلک نمودار ہوئی۔

"مگر.....؟" اتنا کہہ کر گمن لال حیرت سے ولیم رشر کی طرف دیکھنے لگا۔ کیسی وجیہہ کڑی گردن ہے ڈاکٹر کی۔ کس قدر پر اعتماد چہرہ ہے ڈاکٹر کا۔

کیا یہ ڈاکٹر جھوٹ بول رہا ہے آج تک دنیا میں کسی ڈاکٹر نے اسے یہ نہیں بتایا کہ اسے کوئی عارضہ نہیں ہے۔ ہر ڈاکٹر بس اس کو ذمہ دار ٹھہراتا تھا یہ پہلا ڈاکٹر تھا.....مگر..... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

گمن لال حیرت سے ڈاکٹر کے چہرے کی طرف تکے جا رہا تھا۔

ڈاکٹر رشر نے مسکرا کے کہا (اس کی مسکراہٹ بھی کس قدر صحت مند اور دلآویز ہے جیسے خوشی اندر سے جھانک رہی ہو۔ عمر بھی پینتیس چھتیس سال سے زیادہ نہ ہو گی۔ گمن لال نے اسے

دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا) "سنو مگن! میرا خیال ہے تمہارے جسم میں کوئی نقص نہیں ہے۔ نقص رسنا کے جسم میں ہے۔"

"رسنا میں؟" مگن لال کی آواز یک لخت اونچی ہو گئی۔

"ہاں ہاں! رسنا میں!! چلاؤ نہیں!!! اطمینان سے میری بات سنو۔ میں ٹیکنیکل تفصیلات میں نہیں جا سکتا۔ تم سمجھ نہیں سکو گے موٹے طریقے سے سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ تمہارا اعصابی نظام بے حد ذکی الحس ہے تمہیں ایسی عورت کی ضرورت نہیں ہے جو لاوے کی طرح بھڑکتی ہو۔ ایسی عورت کا جسمانی ٹمپریچر تمہارے اعصابی نظام کو شل کر دے گا۔ بدقسمتی سے اس عمر میں جس میں رسنا ہے نوجوان عورتوں کا جسمانی ٹمپریچر بالعموم یہی ہوتا ہے۔ پھر جلد کے اندرونی خلیوں میں جسم کے ہر حصے سے مرد اور عورت کے درمیان الیکٹریکل چارج گزرتے رہتے ہیں۔ وہ مرد اور عورت کے درمیان ایک مخصوص قسم کا جنسی توازن بناتے ہیں اگر وہ الیکٹریکل چارج ایک طرف سے بہت اونچا ہے اور دوسری طرف سے بہت نیچا ہے تو توازن قائم نہیں ہو گا۔ تمہارا حساس اعصابی نظام دوسری طرف سے آنے والے الیکٹریکل چارج کو برداشت نہیں کرتا اور مثبت، منفیت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یا نیوٹرل چارج میں بدل جاتی ہے۔

"مگر وہ دوسری عورتیں۔۔۔۔؟" مگن لال نے فقرہ ناتمام رہنے دیا۔

"بدقسمتی سے تمہیں جو بھی عورتیں ملیں۔۔۔۔ ہائی وولٹیج والی تھیں۔ ورنہ تمہارے جسم میں کوئی نقص نہیں ہے۔ وہ ایک ذہین اور حساس اعصابی نظام کا مکمل نمونہ ہے۔ میں تمہارے اعصابی نظام میں کوئی تبدیلی لانا پسند نہیں کروں گا۔ مگر میں رسنا کا علاج کرنا چاہوں گا۔ اس کا جسمانی ٹمپریچر بدلنا چاہوں گا اس کی نفسیات کا مطالعہ کر کے۔ اس کی عادات، خوراک پوشش میں مناسب تبدیلی پیدا کرنا چاہوں گا اس کی جلد کا مطالعہ کر کے اندرونی

خلیوں کی بایو کیمیکل بجلی کی رو کو دھیما کرنا چاہوں گا۔ مگر یہ سب کچھ تمہاری اجازت سے۔ تمہاری تحریری اجازت کے بغیر نہیں ہو سکتا ہے۔"

مگن لال کا دل خوشی سے اُچھلنے لگا۔ بڑی مشکل سے بولا۔

"ڈاکٹر کیا تمہیں واقعی یقین ہے کہ مجھ میں کوئی نقص نہیں ہے۔؟"

"سو فیصدی!"

"اور رسنا تمہارے علاج سے اچھی ہو جائے گی۔"

"اس کی بھی مجھے سو فی صدی امید ہے رسنا ضرور میرے علاج سے اچھی ہو جائے گی اس میں وقت بھی لگے گا اور مصارف بھی خاصے آئیں گے مگر بالآخر اس بات کی قوی امید ہے کہ رسنا کے جسم کا الیکٹریکل توازن میں ضرور ٹھیک کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔"

مگن لال نے پُرجوش طریقے سے ڈاکٹر ولیم رشر سے ہاتھ ملایا اور کانپتی ہوئی پُرامید آواز میں بولا۔

"ڈاکٹر تم علاج شروع کر سکتے ہو۔"

ولیم رشر رسنا کو کئی بار سینما لے گیا۔ اس کا اندازہ بالکل صحیح نِکلا رسنا رومانٹک تصویریں بالکل پسند نہیں کرتی تھی وہ زیادہ تر HORROR پکچرز دیکھنا پسند کرتی تھی۔ ایسی تصویریں جن میں جنونانہ مار دھاڑ ہو یا پُراسرار پُرہیبت ماحول ہو یا خوفناک جسمانی اذیت کے پُرہول نظارے ہوں ایسی تصویروں سے اسے ایک عجیب قسم کا ذہنی سکون ملتا تھا۔

ولیم رشر اسے کئی بار سمندر کے کنارے ٹہلانے لے گیا اور پھر اس کا اندازہ صحیح نِکلا رسنا کو خاموش سُستاتا ہوا سمندر پسند نہیں تھا بپھرے ہوئے سمندر کی طوفانی لہریں اسے بے حد پسند آئیں ــــ

"جی چاہتا ہے دوڑ کر ان میں کود جاؤں۔" رسنا ڈاکٹر کی طرف دیکھ کر بولی۔

وہ اس وقت سمندر کے کنارے ایک سنسان ساحل پر کھڑے تھے دور دور تک کوئی آدمی نظر نہیں آتا تھا۔

"تو کود جاؤ!" ڈاکٹر نے کہا۔

"مجھے تیرنا نہیں آتا۔"

"کوئی مضائقہ نہیں۔ کمر تک پانی میں نہاؤ۔ دور تک آگے مت جاؤ۔"

"میں ڈوب جاؤں گی۔" رسنا کانپ کر بولی۔

"میں تمہیں بچاؤں گا مجھے تیرنا آتا ہے۔" ولیم رشر بولا "سارے کپڑے اتار دو اور پانی میں گھس جاؤ۔"

"ہائے!" رسنا اکدم خوشی اور ڈر سے بول پڑی "میرے پاس تو بکنی بھی نہیں ہے۔"

"کوئی پرواہ نہ کرو! میں منہ پھیر لیتا ہوں۔ تم کپڑے اتار کر مجھے سمندر میں گھس کر آواز دینا۔"

"نہیں!" رسنا شرماتے ہوئے بولی۔ اس کے گال سُرخ ہو گئے اور تیز ہوا سے اس کے بال بکھر بکھر کے اس کے ماتھے پر آ رہے تھے۔

ولیم رشر نے اس کے کانپتے ہوئے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑی نرمی مگر بڑی مضبوطی سے کہا۔

"جیسا میں کہوں ویسا کرو!"

"تو تم اپنا منہ ادھر کر لو۔"

"لو کر لیا۔"

دھیرے دھیرے جھجکتے ہوئے رسنا نے سارے کپڑے اتار دیئے۔ صرف ایک چڈی

اور چولی پہنے ہوئے پانی میں گھس گئی اور لہروں سے کھیلنے لگی۔ یکایک ہنسی کا فوارہ سا اس کے منہ سے اُبل پڑا۔ وہ چیخ کر بچوں کی طرح چنچل آواز میں بولی۔

"تم بھی آجاؤ پانی بہت مزیدار ہے۔"

پانی رسنا کے سارے جسم میں گدگدی کر رہا تھا۔ جھاگ کے سفید سفید بلبلے اس کے سارے جسم کو چوم رہے تھے۔ چاروں طرف پانی ہی پانی کی بانہیں۔ وہ اور بھی سمندر کے اندر پانی میں گھس گئی۔

"آجاؤ! سمندر بہت مزیدار ہے۔"

"آگے مت جاؤ!" رشر نے اسے تنبیہ کی۔

"میں تو جاؤں گی۔" رسنا بچوں کی طرح منہ بناتے ہوئے بولی۔

وہ دو قدم اور پانی کے اندر گئی۔

سمندر کی ایک بہت بڑی اچھال یکایک اس کے بدن سے ٹکرا کر ٹوٹ گئی۔ پانی بہتے ہوئے جذبوں کی طرح اس کے بدن پر سے گزر رہا تھا۔ جھاگ کی سیمیں کرنیں آوارہ قہقہوں کی طرح اس کے جسم پر رقصاں تھیں۔ رسنا خوشی سے بے اختیار ہنسنے لگی۔ لہریں اور دور تک انگڑائیوں کی طرح ٹوٹنے لگی تھیں۔

کھلا نیلا آسمان رشر کی آنکھوں کی طرح صاف اور بے داغ، دور دور، کہیں کہیں، اونچے لمبے ناریل کے درخت رشر کے جوان اور مضبوط جسم کی طرح تنومند اور اکیلے۔ سمندر کا پُرشور آرکسٹرا اور لہروں کی جوان بانہیں۔

رسنا نے دو قدم آگے اور گرلئے۔ اب پانی اس کے کندھوں تک تھا۔

"اب آگے مت جاؤ۔" رشر مسکرا کر بولا رسنا اُسے اپنے کپڑے اتارتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

رشمر نے قمیض اتار دی تھی۔ اس کے سینے کے بھورے بال ہوا میں ہولے ہولے ہلنے لگے۔ جیسے اوپر پیڑ کی چوٹی پر ہوا میں ہلتی ہوئی ناریل کی سبز سبز مور پنکھیاں ۔۔۔۔!

"اپنی آنکھیں بند کر لو۔" رشمر رک کر بولا۔

رسنا زور سے ہنسی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

یکایک سمندر کی دوسری اچھال آئی اور رسنا کے سر سے گزر گئی۔ جب گزر گئی تو رسنا کا کہیں وجود نہیں تھا صرف گرداب کے تھپیڑے تھے اور کف آلود سمندر، چند لمحوں کے بعد قریب کے پانیوں میں رسنا کا جسم رشمر کو پانیوں میں ہاتھ مارتا نظر آیا۔ وہ اچھل کر پانی میں کود گیا۔

"میں ڈوب رہی ہوں۔" رسنا یکبارگی زور سے چلائی۔ پھر ڈوب گئی۔

پھر دوبارہ جب اُبھری تو رشمر کی باہنوں نے اسے اوپر اچھال لیا۔ وہ پانی میں بہت گہری تھی چند لمحوں میں رشمر نے معاملے کو سنبھال لیا تھا۔ وہ اب بازوؤں میں اٹھائے ہوئے ساحل کی طرف لا رہا تھا۔

رسنا پانی کی کُلّیاں کرتی تھی۔ ڈر سے اس کے سینے سے لپٹی جا رہی تھی۔ خوف سے ہانپتی تھی۔ بچ جانے کی خوشی تھی۔ رشمر کی باہنیں بہت آرام دہ تھیں اس لئے اسے کچھ بُرا سا بھی لگا۔ جب صاف خشک ریت پر آگئے رشمر نے اسے الگ لٹا دیا۔

"اٹ واز۔۔۔۔۔۔ اٹ واز۔۔۔۔۔ ٹچ۔۔۔۔۔ اینڈ گو۔" (IT WOUS TOUCH AND GO) ہانپتے ہوئے وہ انگریزی میں بولی۔

"شیور (SURE)" رشمر نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

"تم میرے اس قدر قریب تھیں۔ جبھی تو میں نے تمہیں پانی میں جانے کی اجازت

دی تھی۔"

رسنا کی گول گول کہنیاں ریت میں گیلے گڑھے بنا رہی تھیں۔ وہ اپنے بازو سیکڑ کر ان گڑھوں میں اپنی انگلی پھیرتے ہوئے بولی۔

"اگر میں ڈوب جاتی تو تم کیا کرتے؟"

"میں سمندر کو آواز دیتا۔ اور لہروں کی اُچھال میں تمہارا جسم وینس کی طرح برآمد ہوتا۔"

"ڈاکٹر رشر!" رسنا بولی۔

"مجھے ول کہو۔"

"ول!!"

"ہوں!"

"جانتے ہو تم نے آج میری جان بچائی ہے؟"

مگر ول کچھ دیر تک نہیں بولا۔ اس نے اپنے ہاتھ چوڑے سینے پر باندھ لئے تھے اور آنکھیں بند کر لی تھیں۔ شاید وہ سو رہا تھا۔

پھر رسنا نہیں بولی۔

صرف سمندر دیر تک گرجتا رہا اور کبھی کبھی کوئی لہر کانوں میں سرگوشی کر جاتی تھی کوئی پون گھنٹے کے بعد جب دھوپ کے تولیے نے ان کے جسم خشک کر دیئے تو رسنا ایک دم چونک اٹھی۔ ڈاکٹر کو اپنے ہاتھ سے جھنجھوڑ کر بولی۔

"اٹھو گھر نہیں چلو گے کیا؟"

کپڑے پہن کر وہ دونوں واپس گاڑی کی طرف چلے

یکایک گاڑی میں بیٹھ کر رسنا نے اپنے دائیں کان کی لَو کو ہاتھ لگا کے کہا.... "میرے

کان کا ایک آویزہ شاید پانی میں ڈوب گیا۔"

"قیمتی تھا؟"

"ہیروں کا تھا۔"

"کوئی مضائقہ نہیں۔ کوئی مچھلی اسے نگل لے گی کوئی ماہی گیر جال ڈال کر اسے پکڑے گا۔ کسی دکان سے کوئی غریب عورت اس مچھلی کو خرید لے گی اور جب اس کا پیٹ چاک کرے گی تو وہ دمکتا ہوا ہیرے کا بندہ ایک معجزے کی طرح برآمد ہو گا۔"

رسنا زور سے ہنسی "دل! تم بھی کتنی دلچسپ بات کرتے ہو۔ ایسی باتیں تو میرے شوہر نے آج تک کبھی مجھ سے نہیں کیں۔"

دل بڑی سنجیدگی سے بولا "شوہر ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔" اس نے بٹن دبا کر گاڑی اسٹارٹ کی۔

جب گاڑی اسٹارٹ ہو کر چلنے لگی تو دور چٹانوں کی اوٹ میں چھپا ہوا مگن لال دیر تک گردن گھما کے سڑک کے نیم دائرے میں گھومتی ہوئی گاڑی کو دیکھتا رہا۔ پھر جب گاڑی موڑ سے غائب ہو گئی تو اس نے پھر اپنی آنکھیں سمندر کے پانیوں پر جما دیں جس میں اس کی ہنسی کی ڈور پڑی تھی۔

دیر تک وہ ہنسی کی ڈور کو ہلائے بغیر سمندر کے پانیوں کو دیکھتا رہا۔

بہت رات گئے مگن لال اپنے عجائب گھر میں گھومتا رہا۔ آج اس نے شدید مصروفیت کا بہانہ کر لیا تھا اور رات کے کھانے پر بھی نہیں آیا تھا اپنا کھانا اس نے اپنے عجائب گھر میں منگوا لیا تھا کھانا کھا کے اور فرنچ کونیاک کے دو چھوٹے چھوٹے جام پی کر وہ شینی کے مجسمے کو اس کے بکسے میں سے کھولنے لگا۔ یہ بکسا آج ہی بذریعہ ہوائی جہاز آیا تھا۔ بکسے میں شینی

کا مشہور مجسمہ پیک تھا۔ اس مجسمے کا نام تھا انگڑائی۔ ایک عورت انگڑائی توڑ رہی تھی۔ مگن لال بڑی بیقراری سے مجسمے کو بکسے میں سے نکالنے لگا۔

بہت رات گئے کھانا کھانے کے بعد رسنا اور ولیم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پہلے کھانے کے کمرے میں پھر ڈاکٹر کے کمرے میں جو رسنا کے کمرے سے لگا ہوا تھا۔ ول کے ہاتھوں رسنا نے پہلی مرتبہ تھوڑی سی پورٹ چکھی۔ وہ پیتی نہیں تھی مگر ول نے اصرار کیا کہ یہ بھی علاج میں شامل ہے شوپان کی دھیمی دھیمی موسیقی ریکارڈ پر چل رہی تھی۔ رسنا کی آنکھوں میں کیف و سرور جھلکنے لگا نیم غنودگی کے نشے میں بولی۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔"

"تم اپنے کمرے میں جاؤ! میں ابھی آتا ہوں۔"

رسنا نے چونک کر کہا "تم کیوں آتے ہو۔؟"

"تمہارے جسم پر مالش کروں گا۔"

رسنا اپنے کمرے میں چلی گئی۔

شیشم کا سیاہ عورت کا بت، قیامت خیز انگڑائی کے پوز میں تھا مگن نے اسے ایک کونے میں کھڑا کر کے اسے چاروں طرف سے غور سے دیکھا بالکل بے عیب، بے نقص، حد درجہ ہیجان انگیز۔ وہ ایک نرم بردار کپڑا لے کر اس سیاہ بت کے اعضا کو چمکانے لگا مگن نے اپنے ریکارڈ پر ایک اداس رومانی دھن کا ریکارڈ لگا دیا تھا۔ پتھر کے بت کے سڈول اعضا بردار کپڑے پر لگے ہوئے پالش سے ہولے ہولے کھلنے لگے مگن لال نے بردار کپڑا نیچے رکھ دیا اور اپنے ہاتھ اس بت کی باہوں پر پھیرنے لگا۔

اس کا اور میرا ٹمپریچر کتنا ملتا ہے یہ پتھر کی ہے۔ میں برف کا ہوں۔ بجلی نہ اس میں نہ مجھ میں.....!

ڈاکٹر رشر نے رسنا کے بیڈ روم میں دو ائر کنڈیشنر منگوائے تھے اس وقت اس نے ان کا ٹمپریچر درست کیا تھا بتیاں بہت دھیمی کر دی تھیں اور اب وہ انتہائی سنجیدگی سے اپنی قمیض کی آستین اوپر چڑھاتے ہوئے رسنا کی پیٹھ پر بادامی رنگ کے ایک مرہم سے مالش کر رہا تھا اس کے سدھے ہوئے مشاق ہاتھ پاؤں کی پوروں سے کمر کے خم تک جاتے تھے اور مالش کے دائرے بناتے ہوئے لوٹ آتے تھے رشر نے رسنا کو بتایا تھا کہ اس مالش کا اثر جلد کے اندرونی خلیوں تک پہنچ کر دھیرے دھیرے رسنا کے اعصابی نظام کو درست کر دے گا۔

ڈاکٹر رشر کمر سے کندھے تک پہنچا۔ اب وہ ڈبل بیڈ کے کنارے کھڑا ہو کر رسنا پر جھک کر اس کے کندھوں اور گردن پر مالش کر رہا تھا۔ مگر رسنا کا اعصابی نظام ٹھنڈا ہونے کے بجائے اس کے جسم کے رگ و پئے میں چنگاریاں بھر رہا تھا دھیرے دھیرے وہ سلگنے لگی۔ پاؤں کی پور سے لے کر گردن کے خم تک وہ اپنے بدن میں بجلی کی ایک تیز رو کو دوڑتی ہوئی محسوس کر رہی تھی۔ پھر بھی وہ دانت پیس کر دم سادھے ہوئے پڑی رہی ہے بھگوان.... یہ بہت مشکل ہے..... بہت مشکل ہے..... اس نے جلدی سے بالوں کی ایک لٹ اپنے منہ میں دبالی اس کے نتھنے پھولنے لگے تھے اور سانس زور زور سے چلنے لگی تھی۔

رسنا نے دونوں ہاتھوں میں اپنا منہ چھپا لیا تھا۔ کل وہ یہ مالش نہیں کرائے گی صاف انکار کر دے گی۔

ہولے سے ڈاکٹر رشر نے اس کے بالوں کی لٹ اس کے منہ سے نکال لی۔ اب اس کے مرہم سے چکنے ہاتھ اس کے بالوں میں تھے...۔ "ناں ناں..... میرے بالوں کو مت چھوؤ۔" رسنا نے اپنے دل میں کہا۔ مگر کچھ بول نہیں سکی۔ اس کا دم رکنے لگا۔ رشر کے ہاتھ بالوں میں آہستہ آہستہ گھوم رہے تھے آہستہ آہستہ گردن اور گدی میں چٹکیاں لیتے ہوئے بالوں کے

امبر کی جلد کو سہلاتے ہوئے بالوں کی ایک ایک لٹ کو سنوارتے ہوئے رشمر کو ایسا لگا جیسے وہ شعلوں میں کنگھی کر رہا ہے۔

یکایک کروٹ بدل کر رسنا اٹھی۔ اس کی آنکھیں شعلہ بار تھیں اور ہونٹ ذرا سے کھلے تھے اس نے غیض وغضب کی ایک تیز نگاہ رشمر پر ڈالی اور اپنے دونوں بازوؤں سے اس کی گردن کو جکڑ کر دیوانہ وار اس کا منہ چومنے لگی۔

..... دل !..... میرے دل ..... !! میرے۔ میرے۔ میرے دل۔

عجائب گھر میں مگن دونوں ہاتھوں سے اس سیاہ بت کے پاؤں پکڑے ہوئے رو رہا تھا۔ دھیرے دھیرے کونے میں ریکارڈ چل رہا تھا۔

آج سجن مورے انگ لگے ہیں
سپھل بھیئو مم دھیا !

دن گزرتے گئے۔ مگن زیادہ سے زیادہ اپنے عجائب گھر میں محصور رہتا گیا۔ محل نما گھر کا زنانہ حصہ۔ رسنا کے کھلے مسرت آمیز قہقہوں سے معمور ہوتا گیا۔ اس کی چال میں زیادہ لچک آگئی تھی اور آنکھوں میں شراروں کی چمک کی جگہ ایک اجلی نتھری دھوپ نے لے لی تھی۔ ایسی دھوپ جو ساون کی گھٹا برس جانے کے بعد آتی ہے اب رسنا ہر وقت گنگناتی رہتی۔ اس پر غشی کے دورے بھی نہیں پڑتے تھے کئی کئی دن وہ مندر بھی نہیں جاتی تھی۔

تین ماہ بعد ڈاکٹر رشمر انگلینڈ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد چھ ماہ بعد رسنا کے یہاں بچہ ہوا۔ کروڑپتی خاندان کا وارث پیدا ہو گیا دادا کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ دان پُن کرنے کے لئے اس نے اپنی تھیلیوں کا منہ کھول دیا۔

پہلی بار جب مگن لال نے اپنے بچے کو دیکھا تو دیر تک خاموشی سے دیکھتا

ہی رہ گیا۔ رسنا نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

اس کا چہرہ ایک مکمل نقاب تھا ڈاکٹر اور دو نرسیں قریب کھڑی تھیں اور وہ بھی اسی کمرے میں ایک طرف کھڑے اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔

بچہ بہت خوبصورت تھا۔ گلابی گلابی پھولے پھولے گال اور ان کے اوپر نیلی نیلی آنکھیں اور شفاف دودھیا ننھے ننھے ہاتھ پاؤں پالنے میں بڑا خوشی سے ہمک رہا تھا۔

مگن نے جھک کر اس بچے کو گہری سنجیدگی سے اپنی باہنوں میں اٹھایا۔ اٹھا کر اپنے سینے سے لگایا۔ اس کے ماتھے پر ایسے بوسہ دیا جیسے وہ ایک صلیب کو بوسہ دے رہا ہو۔ پھر اس نے بڑی احتیاط سے بچے کو پالنے میں واپس رکھ دیا۔ اور چپ چاپ کچھ کہے بغیر کمرے سے نکل گیا۔

دوسرے سال ڈاکٹر رشر پھر علاج کے لئے آیا۔ آیا تو تھا دو ماہ کے لئے مگر رسنا نے اصرار کر کے مزید دو تین ماہ کے لئے روک لیا اس کے جانے کے سات ماہ بعد پھر ایک لڑکا ہوا۔ پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت اور تندرست ....!؟"

دوسرے بچے کی زچگی سے فارغ ہو کر رسنا بھی تبدیلیٔ آب و ہوا کے لئے سوئٹزرلینڈ چلی گئی اپنے دونوں بچوں کو لے کر۔ اس کا ارادہ چند ماہ کے لئے یورپ میں سیاحت کرنے کا تھا۔ کروڑ پتی سیٹھ نے یہ طے کر لیا تھا کہ اس قیام کے دوران میں ڈاکٹر رشر پورے وقت رسنا کے ساتھ رہے گا اور ہر دم اس کی صحت کا خیال رکھے گا۔

جب رسنا یورپ چلی گئی تو اس کے چند روز بعد ایک رات مگن لال اپنے باپ کی خواب گاہ میں گیا اور اس سے کہا

اب جب کہ آپ کے خاندان کے دو وارث پیدا ہو گئے ہیں بلکہ ممکن ہے تیسرا

بھی ہو جائے۔ میں یہاں سے جانا چاہوں گا۔"

"جہاں چاہو جا سکتے ہو۔ میں نے آج تک تمہاری کونسی خواہش پوری نہیں کی ہے۔"

سیٹھ چونی لال نے اس سے کہا...... میں تو چاہتا تھا یورپ کے سفر پر تم بھی رسنا کے ساتھ جاتے۔ مگر تم نے خود ہی انکار کر دیا۔ اب کہاں جانا چاہتے ہو؟"

"آپ سمجھتے نہیں ہیں۔" مگن لال نے اپنے باپ سے کہا۔ "میں نے اس گھر کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"کسی دوسرے گھر میں رہنا چاہتے ہو؟"

"نہیں۔ مجھے......!" مگن رک رک کر کہنے لگا۔ "میں دراصل اس گھر کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینا چاہتا ہوں۔ میں آپ سے ایک پیسہ بھی نہیں لینا چاہتا۔ صرف چند چیزیں یہاں سے لے جاؤں گا۔ اور پھر کبھی آپ کو اپنی صورت نہیں دکھاؤں گا۔"

"مگر کیوں؟"

"وجہ آپ جانتے ہیں!"

سیٹھ چونی لال دیر تک چپ چاپ رہا۔ پھر کسی قدر سخت لہجے میں بولا۔

"احمق مت بنو! تم اگر میری جگہ ہوتے تو یہی کرتے، جانتے ہو، ہمارا خاندان، ہندوستان کے پہلے تیس خاندانوں میں سے ہے۔ دولت اور طاقت کے اعتبار سے یہی تیس خاندان ہندوستان پر حکومت کرتے ہیں۔ وزیروں کے نام اور عہدے بے شک بدلتے رہتے ہیں مگر دراصل حکومت ہماری ہے۔ تم کیا جانتے ہو!؟ میں اس طاقت اور دولت کو لاولد چھوڑ دیتا؟ اور اپنے دشمن کے ہاتھوں میں جانے دیتا؟"

"وہ بچے میرے نہیں ہیں۔ اور اب وہ بیوی میری بیوی نہیں ہے۔"

"اس طرح سے یہ دولت جو ہم نے گزشتہ سو سال میں اکٹھی کی ہے دراصل ہماری نہیں ہے۔ اخلاق کے ایسے کھوکھلے اصول اسٹیج پر اور مذہبی کتابوں میں بڑے اعلیٰ معلوم ہوتے ہیں مگر زندگی میں ان کا کیا کام ....؟ تمہارے آباؤ اجداد اگر ان اصولوں پر چلتے تو آج ہم دونوں فٹ پاتھ پر ہوتے۔ احمق مت بنو!"

مگن لال نے بڑے غصے سے شانے اچکائے۔

اس کے باپ نے مگن لال کو شانے سے پکڑ کر قریب کی ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ خود پلنگ پر بیٹھا تھا کرسی اور پلنگ کے بیچ میں ایک چھوٹی تپائی تھی جس پر اس کے دونوں خوبصورت پوتوں کی تصویریں کیبنٹ سائز کے فریم میں جڑی رکھی تھیں۔

سیٹھ چونی لال کا ہاتھ دیر تک ان دونوں بچوں کے فریم سے کھیلتا رہا۔ اس کی بے چین انگلیاں کبھی ایک فریم پر جاتیں کبھی دوسرے فریم پر آخر اس نے نگاہ اٹھا کر اپنے بیٹے کی طرف دیکھا اور تصویروں کی طرف اشارہ کر کے تیز نشتر کے انداز میں بولا۔

ایک دن میں بھی اسی طرح پیدا ہوا تھا۔

مگن لال نے وہ دنیا چھوڑ دی تھی اور اب اکیلا شہر کی سڑکوں پر گھوم رہا تھا آتے وقت اس نے اپنے ساتھ کچھ نہیں لیا تھا صرف چاندی کے اس چھوٹے سے فریم کو جس میں میں بند تھا اٹھا کر اپنی پتلون کی جیب میں ڈال لیا تھا اس کی جیب میں صرف چند آنے تھے۔ اور وہ اسی طرح گھر سے نکل آیا تھا۔ چوروں کی طرح۔ باپ کو بتائے بغیر۔ کوئی چٹھی چھوڑے بغیر مگر اب اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ اس گھر میں کبھی واپس نہیں جائے گا۔

وہ کیسے اپنی زندگی بسر کرے گا۔؟ اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہ کیا کام کر سکتا ہے؟ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا دراصل آج تک جس دن سے وہ پیدا ہوا اس نے کوئی کام نہیں کیا

تھا اس کا سارا جسم آج تک مکمل بیکار رہا تھا ہاتھ پاؤں دل دماغ رگ وریشے، نسیں، پٹھے سب بیکار رہے تھے زندگی بھر چاندی کے چمچے سے اسے دودھ پلایا گیا تھا بے بہار کے انگوری دانوں کی طرح اسے ہمیشہ نرم روئی اور ریشم اور سنجاب میں لپیٹ کر رکھا گیا اسے اپنے جسم کو کبھی ٹھیک سے استعمال کرنے کا موقع نہیں ملا۔

کچھ بھی ہو وہ کبھی واپس نہیں جائے گا۔

دیر تک وہ سڑکوں پہ ادھر ادھر گھومتا رہا، بے مقصد آوارہ وہ گھومنا چاہتا تھا وہ چلتے رہنا چاہتا تھا اسے ڈر تھا کہ اگر کہیں وہ رک گیا تو کہیں واپس نہ چلا جائے اپنی زندگی میں آج تک کبھی اتنا نہ چلا تھا۔ محض چند قدم چلا تھا۔ پورچ سے گاڑی تک، دکان سے فٹ پاتھ تک لفٹ سے برآمدے تک بس پیدل چلنے کے یہی چند قدم اسے یاد تھے اس کے سارے جسم سے پسینہ بہہ رہا تھا پھر بھی وہ چلتا گیا۔

رات کے گیارہ بجے تک وہ تھک کر سدانند روڈ کے ناکے پر ایک بارہ منزلہ اونچی گر نامکمل بلڈنگ کے باہر روڑی اور بجری کے ڈھیر پر سو گیا۔ سامنے سے سمندر کی کھلی خوشگوار ہوا کے جھونکے آرہے تھے وہ کمر سیدھی کرکے پاؤں پھیلاتے ہی سو گیا۔

کب تک سوتا رہا اسے کچھ معلوم نہیں تھا یکایک کسی نے اسے زور سے جھنجھوڑ کر جگایا۔ ہڑبڑا کر اس نے آنکھیں کھول دیں تیز دھوپ کی روشنی اس کی آنکھوں میں بھالے کی طرح چبھ گئی وہ پلکیں جھپکاتے آنکھیں ملتے جلدی سے اٹھ بیٹھا۔

ایک کسی ہوئی تنومند سیاہ عورت بجری کی ٹوکری اٹھائے اس کے سر پر کھڑی تھی۔ مگر پہلے نہ صرف اس نے اس کی ننگی پنڈلیاں دیکھی تھیں۔ انہیں دیکھ کر وہ ایک دم چونک گیا۔ شیشم کا بت؛ جلدی سے اس کی نگاہ اوپر اٹھ گئی۔

"اے بابو اٹھ کب تک سوتا رہے گا؟
اس کے سفید دانت بجلی کی طرح چمکے۔
"کیا رات کو دارو جیادہ چڑھا گئے تھے۔؟"
اتنا کہہ کر اس نے ڈھیر سے ٹوکری میں بجری بھری اور ٹوکری کو اٹھا کے اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر بلڈنگ کی طرف چلی گئی وہ دیر تک اس کی لچکتی کمر اور ڈولتی چھاتیوں کی طرف حیرت سے دیکھتا رہا۔ کیا شینی نے اس عورت کو دیکھ کر وہ کالا بت بنایا تھا؟۔
وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اپنے دونوں بازو اس نے ٹانگوں پر باندھ لئے اور گھٹنوں پر اپنی ٹھوڑی ٹکا لی اور اس عورت کو دیکھنے لگا جواب پھر بجری اٹھانے کے لئے اس کی طرف آ رہی تھی۔
وہ بولی۔ ۔ ۔ ۔ "اب گھر جاؤ۔"
وہ بولا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "گھر تو چھوڑ دیا۔"
"تو دھندے پر جاؤ۔"
"میں کوئی دھندا بھی نہیں جانتا۔" وہ افسوس سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔
"تو اب تک کیسے جندہ تھے؟"
"جندہ بھی تھا کہ نہیں، اس میں بھی شبہ ہے۔"
"عجیب آدمی ہے!" سیاہ عورت نے حیرت سے سر ہلایا اس کی ایک جھلکتی ہوئی لٹ اڑ کر رخسار سے نیچے گر کر ہل رہی تھی اس نے جلدی سے اسے کس کر جوڑے میں باندھ لیا۔ پسینے میں اس کا جسم چمک رہا تھا۔
"مجھے پیاس لگی ہے۔" مگن لال نے اپنے خشک ہونٹوں پر اپنی خشک زبان پھیری۔

"وہ ادھر سیمنٹ اور بجری مکس کرنے کی جاگہ پر پانی کا نل ہے جلدی سے جا کے پی لو۔"

پی کے آیا۔ پھر وہیں بجری کے ڈھیر پر بیٹھ گیا۔

"تم جاتے کیوں نہیں؟" اس سیاہ عورت نے پھر ٹوکری میں بجری بھرتے ہوئے کہا۔

"بھوک لگی ہے۔"

"بھوک لگی ہے تو کوئی کام کرو!" وہ ٹوکری اٹھا کے پھر چلی گئی۔

جب واپس آئی تو مگن لال نے کہا۔" مجھے کوئی کام دلوا دو!"

"کیا کام کر سکتے ہو؟"

"جو تم کر سکتی ہو۔"

"میں تو بجری کی ٹوکری اٹھاتی ہوں۔"

"میں بھی اٹھا لوں گا۔"

وہ اس کے زرد چہرے اور اس کے دبلے پتلے جسم کو دیکھ کر ہنسی۔ کچھ کہا نہیں اس نے ٹوکری اٹھا کر چلی گئی۔ پھر جو واپس آئی تو، سفید بالوں اور سفید مونچھوں والے ایک بڈھے کو ساتھ لے کر آئی۔

مگن لال کو دیکھ کر اس سفید مونچھوں والے بڈھے کے چہرے پر ایک تبسم آیا۔۔۔۔۔۔بولا "اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔"

مگن لال اٹھ کر بجری کے ڈھیر پر کھڑا ہو گیا۔

بڈھے نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پھر بولا "کام کرے گا؟"

"کرے گا۔"

"ادھر مرد لوگ کو ڈیڑھ روپیہ روج ملتا ہے۔ عورت لوگ کو ایک روپیہ ملتا ہے۔

—— تمہارا شریر بہت دبلا ہے۔ جنائی مالک ہے۔" وہ ہنسا" تم کو صرف ایک روپیہ روج ملے گا۔ چلے گا۔؟"

"چلے گا۔"

"تو پھر اٹھاؤ ٹوکری اور بجری بھرو!"

دن بھر وہ بجری بھرتا رہا۔ پہلی بیس پچیس ٹوکریوں میں تو اسے کوئی تکلیف نہ ہوئی پھر ہوتے ہوتے تو اعضا شل ہونے لگے ٹوکری بھاری معلوم ہونے لگی۔ جسم سے پسینہ پھوٹ کر بہنے لگا۔ سورج کی کرنیں اس کے جسم میں سوئیوں کی طرح چبھنے لگیں اسے بار بار پیاس لگنے لگی ہاتھ پاؤں بھاری محسوس ہونے لگے۔ جیسے اس کی رگوں میں خون کے بجائے پگھلا ہوا سیسہ بہہ رہا ہے۔ پھر بھی وہ دانت پیس کر دن بھر ٹوکری اٹھاتا رہا۔ دن میں دس مرتبہ اسے خیال آیا کہ وہ ٹوکری پھینک کر چلا جائے۔ سڑک پر سے گزرتی ہوئی کسی ٹیکسی کو آواز دے کر روک لے اور سیدھا اپنے عیش و فراغت کے گہوارے میں واپس چلا جائے۔ مگر وہ دانت پیس کر کام کرتا رہا۔ شام کو جب اسے چھٹی ملی تو وہ اس بجری کے ڈھیر پہ خالی ٹوکری پھینک کر ہانپتا ہوا لیٹ گیا۔ شام کی سمندری ہوا ہوتے ہوتے اس کے جسم کا پسینہ خشک کرتی چلی گئی اسے نیند سی آنے لگی اسے اپنے جسم میں انتہائی نقاہت سی محسوس ہونے لگی تھی اسے معلوم بھی نہیں رہا کب اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں؟ کب وہ سو گیا؟ ایکا ایکی رات کو کسی نے اسے جھنجھوڑ کر جگایا۔

وہ کالی عورت اس کے سر پر جھکی ہوئی کہہ رہی تھی:" اٹھو کھانا کھا لو۔ کیا بھوکے ہی سو جاؤگے؟"

اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ سمندر تاریک ہو چکا ہے۔ بارہ منزلہ نامکمل بلڈنگ

ایک خوفناک دیو کی طرح منہ پھاڑے کھڑی تھی اس کے قدموں میں مزدوروں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں آگ جلائے کھانا کھانے میں مصروف تھیں آوازیں، گالیاں، ہنسی، عورتوں کی چہکاریں ننگ دھڑنگ بچے آدھی چپاتی ہاتھ میں لئے جبڑے چلاتے ہوئے۔

ایک موٹی چپاتی پر اس کالی عورت نے تھوڑا سا ساگ رکھ دیا۔ پہلے تو گمن کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس کا کیا کرے؟ وہ چھری کانٹوں سے کھانے کا عادی تھا اور کوئی طریقہ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ مگر اب اسے بھوک بھی زوروں سے لگ رہی تھی اس نے چپاتی کو توڑ توڑ کر بڑی سنجیدگی سے ایک سا بیچ نما سینڈوچ بنایا اور اسے بڑی ادا سے کھانے لگا سیاہ عورت مسکرا کر اس کی طرف دیکھتی رہی۔ کھا کر اس نے کہا" ایک چپاتی اور دو!"

"نہیں!" وہ بولی " آج کل راشن مہنگا ہے پہلے ہم دو چپاتی کھاتے تھے۔ اب ہم سب لوگ ایک ایک چپاتی کھاتے ہیں۔"

" مگر مجھے بہت بھوک لگی ہے۔"

تونل سے جیادہ پانی پی کر سو جاؤ۔ پر دوسری چپاتی نہیں ملے گی۔

نل سے پانی پی کر وہ پھر اپنی جگہ لیٹ گیا۔ پر اب اسے نیند نہیں آ رہی تھی آسمان پر تارے کھلے ہوئے تھے۔ وہ دیر تک انہیں دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کروٹ بدل کر اپنے قریب لیٹی ہوئی عورت کو غور سے دیکھا وہ بھی اپنی کھلی آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

" تمہارا نام کیا ہے۔؟" گمن لال نے اس سے پوچھا۔

"تلسی۔" وہ بولی۔

" تمہارا گھر والا کدھر ہے؟"

"میں نے اپنے گھر کو چھوڑ دیا ہے۔"

"کیوں؟"

"دارو پیتا تھا۔"

"کوئی بال بچہ؟"

"ایک لڑکی تھی۔ تاپی مر گئی۔"

وہ دیر تک چپ رہا..... دیر تک وہ چپ رہی..... ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے آتے رہے اور گمن کے بدن کو گدگداتے رہے۔ تلسی نے اپنے دونوں بازو اپنی چھاتیوں پر باندھ لئے تھے اور بظاہر آسمان کو دیکھنے میں منہمک تھی۔ پھر وہ اچانک بولی۔

"تمہارا نام؟"

"گمن۔"

"گھر والی؟"

"وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔"

"کوئی بال بچہ؟"

"کوئی نہیں۔"

پھر رات بھر تلسی نہیں بولی۔ گمن بھی تارے گنتے گنتے سو گیا۔ صبح جب اٹھا تو اس کا سارا جسم تپ رہا تھا۔ اور سارا جسم دکھ رہا تھا۔ پر اس نے تلسی کو کچھ نہیں بتایا۔ ٹوکری اٹھا کے دن بھر کام کرتا رہا۔ کبھی کبھی اسے ایسا محسوس ہوتا۔ جیسے کام کرتے کرتے اس کا دم نکل جائے گا۔ مگر پھر بھی دانت پیس کر وہ کام کرتا رہا۔ شام کو بالکل بے دم ہو کر زمین پر بے سدھ پڑ گیا۔ رات کو تلسی نے اسے جگایا۔ وہ ہاتھ میں تھالی لئے اس کے سرہانے بیٹھی

تھی۔ اور اس کی طرف ہمدردی بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

"تمہیں تو بخار ہے۔"

"یونہی سا ہے۔"

"کوئی دوا لو گے؟"

"نہیں کل تک ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

"اٹھو کھانا کھالو۔ آج تمہیں دو چپاتیاں ملیں گی۔"

تلسی نے تھالی اس کے سامنے رکھ دی۔ اپنا کھانا اس میں سے اٹھا لیا۔

"تم تھالی لے لو۔" تلسی نے اصرار کیا۔

مگن نے تھالی میں کھانا کھالیا۔ کھانا کھاتے ہی سو گیا۔ کچھ تو بخار تھا، کچھ تھکن، بالکل بے سُدھ ہو کر سو گیا۔ رات کو تلسی دو ایک بار اُٹھی۔ اس نے مگن کو بجری کے ڈھیر پر بالکل بچوں کی طرح سوتے دیکھا۔ گول گیند کی طرح۔ گھٹنوں میں اپنا منہ چھپائے ہوئے۔ تلسی نے اپنا پرانا بوسیدہ مگر گرم لحاف اس پر ڈال دیا۔ بہت صبح سویرے جب مگن کو پیاس لگی تو اس نے تلسی کے لحاف کو اپنے جسم کے اوپر دیکھا۔ قریب میں تلسی بے خبر سو رہی تھی۔ تارے ماند پڑ رہے تھے۔ بارہ منزلہ بلڈنگ کے نامکمل دروازوں، کھڑکیوں کی مستطیلوں میں سے روشنی چھن کے آ رہی تھی۔ اس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ بخار کل سے بھی تیز تھا۔ اور ہتھیلیاں بجری اٹھا اٹھا کر سوج گئی تھیں۔

آج اسے کام کرتے ہوئے بے حد تکلیف ہوتی رہی۔ اسے ایسا لگتا تھا جیسے اس کا جسم لکڑی کے جوڑوں سے بنا ہے۔ یا مشین کے زنگ کھائے ہوئے پرزوں سے۔ آج وہ بہت جلد ہانپ جاتا ہے۔ آنکھوں کے آگے ترمرے سے ناچنے لگتے ہیں۔ کبھی کبھی سارا

آسمان لال ہو جاتا ہے۔ سر میں چکر آتا ہے۔ تلسی نے اسے کام کرنے سے منع کیا۔ مگر وہ نہ مانا۔ گرتا پڑتا کسی نہ کسی طرح سے دن بھر ٹوکری ڈھوتا رہا۔ شام تک خود بخود اس کا بخار کم ہو گیا۔ بدن ہلکا ہلکا سا لگنے لگا۔ دوسرے دن بخار اور بھی کم ہو گیا۔ تیسرے دن آپ ہی آپ ٹوٹ گیا۔ کوئی دوا کئے بغیر۔ مگر ہاتھوں کی بُری حالت ہو چکی تھی۔ ٹوکری ڈھوتے ڈھوتے کھال تک ادھڑنے لگی تھی۔ تیسری رات یہ حالت ہو گئی کہ وہ اپنے ہاتھوں سے کھانا بھی نہیں کھا سکتا تھا۔

"میرے قریب آؤ۔ میں تمہیں کھلا دوں۔"

"نہیں!" گمن نے سر ہلا کر انکار کر دیا۔ مگر روٹی اٹھا کر جو لقمہ توڑنا چاہا۔ تو لقمہ اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔

"ادھر آؤ" تلسی گرج کر بولی اور اس نے گمن کی تھالی کو اپنے قریب سرکا لیا۔ گمن اس کے قریب چلا گیا۔ وہ ایک لقمہ توڑ کر اس کے منہ میں دیتی۔ دوسرا لقمہ توڑ کر اپنے منہ میں رکھتی۔ دونوں جبڑے چلاتے ہوئے مسرور نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ تلسی کی آنکھیں تارا جیسی چمک رہی تھیں، اور گمن کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے رگ و ریشے میں رچا ہوا برسوں کا زنگ دھیرے دھیرے دھل رہا ہے۔ اس کی روح کے گرد جمی ہوئی برف کا دائرہ ہولے ہولے پگھل رہا ہے۔

کھانا کھلا کے اور تھالی برتن صاف کر کے تلسی نے کہیں سے تیل کی ایک چھوٹی سی شیشی نکالی۔ اور گمن کے ہاتھوں کو دھیرے دھیرے چپڑنے لگی۔ تیل چپڑ کر اس نے اپنی ایک بے حد پرانی اور بوسیدہ ساڑھی نکالی اور اس کی دھجیاں پھاڑ پھاڑ کر اس نے گمن کی ہتھیلیوں کو باندھ دیا۔

دوسرے دن گمن انہیں دھجیوں سے بندھے ہاتھوں سے ٹوکری اٹھا اٹھا کے کام کرتا رہا۔ اگلے چار پانچ دنوں میں اس کے ہاتھوں کے زخم بھر گئے۔ سوجن غائب ہو گئی..... ہاتھوں میں سخت گھٹے پڑ گئے۔ اب وہ بغیر کسی تکلیف کے اپنے ہاتھوں سے بجری بھر سکتا تھا۔ اس کے جسم کی زردی ہولے ہولے دور ہوتی گئی۔ کھلی دھوپ، کھلی ہوا اور رات کی کھلی فضا سے اس کے جسم میں ایک نئی طاقت دوڑنے لگی۔ اگلے پندرہ بیس دن میں وہ اتنا اچھا کام کرنے لگا کہ سفید مونچھوں والے نے اسے ترقی دے کر اسے مردوں کے گریڈ میں رکھ دیا۔ اب اسے ڈیڑھ روپیہ روز ملنے لگا۔ وہ تلسی کو دن کے کھانے کے پانچ آنے اور رات کے کھانے کے چھ آنے دیتا تھا۔ دو آنے کی چائے پیتا تھا۔ کبھی چار آنے کی۔ باقی پیسے وہ تلسی کے پاس ہی رکھ دیتا تھا۔ اس کے جوتے ٹوٹ گئے تھے پتلون پھٹ کر نیکر بن گئی تھی۔ اور گھٹنوں سے ذرا نیچے چیتھڑوں کی طرح لٹک رہی تھی..... مگر وہ خوش تھا۔

چند دن بعد تلسی اس کے لئے بھورے رنگ کی ایک لنگی لے آئی۔ اس نے اپنی نیکر نما چیتھڑوں والی پتلون اتار کر اسے وہ لنگی پہننے کو کہا۔ پہلے تو گمن نے انکار کیا مگر تلسی کا چہرہ دیکھ کر وہ مان گیا۔ آج وہ خوب نہایا۔ پہلی بار تلسی نے اس کے کپڑے دھوئے۔ اس کے بالوں میں تیل ڈال کر اس کے سر کی اچھی طرح مالش کی۔ اور اپنے کنگھے سے اس کے سر کے بال سنوار دیئے۔ آج وہ بار بار بے اختیار مسکرا رہی تھی۔ ہنس رہی تھی۔ گنگنا رہی تھی۔ اور جب چلتی تھی تو فضا میں اس کا جسم ایک ابابیل کی طرح ڈولتا ہوا اور تیرتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

اسی طرح کام کرتے کرتے ایک ماہ اور گزر گیا۔ گمن اپنے بدن میں ایک نئی پھرتی، چستی اور طاقت محسوس کرنے لگا۔ اس کا سارا بدن سنولا گیا تھا۔ بانہوں کی مچھلیاں ابھر آئی تھیں اور پاؤں کے تلوے بجری کے پتھروں کی طرح سخت ہو چلے تھے۔ بلڈنگ بھی مکمل

ہو چلی تھی ۔ چند دنوں میں کام ختم ہو جائے گا ۔ پھر انہیں یہ بلڈنگ چھوڑ دینا پڑے گی ۔

"پھر ہم کیا کریں گے ؟" گمن نے کسی قدر پریشان ہو کر تلسی سے پوچھا ۔

تلسی بڑی لاپرواہی سے بولی ۔" اونہہ ! کسی دوسری بلڈنگ پر جا کے ٹوکری ڈھولیں گے ۔ بہت بلڈنگیں بن رہی ہیں ۔"

اس کے لہجے میں ایسا گہرا اطمینان تھا کہ گمن کو یقین آگیا ۔ وہ کروٹ بدل کر سو گیا ۔

ابھی اسے سوئے ہوئے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ اس کے کان شور و غل کی آواز سے چونک گئے ۔ اور وہ آنکھیں کھول کر بیدار ہو گیا ۔

ایک آدمی تلسی کو لاتوں ہاتھوں سے گھسیٹ کر پیٹنے کی کوشش کر رہا تھا ۔ تلسی زور زور سے چلا رہی تھی اور اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی ۔ دونوں میں ہاتھا پائی ہو رہی تھی ۔ ایک دم گمن لال گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور ان دونوں کے قریب جا کر بولا ..." کیا ہے ؟"

"تم کو کیا ہے ؟" وہ آدمی غرا کر بولا ۔" یہ میری گھر والی ہے ۔ اس کو لے جا رہا ہوں ۔"

" نہ تو میرا گھر والا ہے ، نہ میں تیری گھر والی ہوں ۔ میں تجھ کو چھوڑ چکی ۔" تلسی غصے سے چیخ رہی تھی ۔ جب سے تو نے میری تائی کی جان لی ۔ میں تجھ کو چھوڑ چکی ۔ آج ڈیڑھ دو سال کے بعد تجھ کو اپنی گھر والی کی یاد آئی ؟"

"جانے دے ، جانے دے !" دوسرا آدمی جو تلسی کے گھر والے سے بھی لمبا تڑنگا تھا ۔ تلسی کو سمجھاتے ہوئے بولا ....." اس کو معاف کر دے گھر چل ۔"

" نہیں میں اس کے سنگ کبھی نہیں جاؤں گی ۔ کبھی اس کے سنگ نہیں رہوں گی ۔ دارو پی پی کر اس نے مجھے بھوکا مار ڈالا ۔ میری ساری کمائی بھی چھین لیتا تھا دارو پی جاتا تھا ۔"

"اب نہیں پیئے گا ۔" دوسرا آدمی بولا ۔

"کیسے نہیں پئے گا؟ ابھی اس ٹیم تم دونوں دارو پی کے آئے ہو!"

"چلتی ہے کہ اور مار کھائے گی؟" کھاکھرے نے تلسی کو لات مار کے کہا۔

گمن لپک کر کھاکھرے کے سامنے آگیا۔ غضب ناک لہجے میں بولا۔

"اس کو چھوڑ دو۔!"

"کیوں چھوڑ دوں؟ کیا تم اس کے یار ہو؟"

گمن نے اس کے منہ پر ایک گھونسا مارا۔ کھاکھرے کے منہ سے خون نکلنے لگا۔ گمن کو بڑی حیرت ہوئی۔ اسے معلوم نہیں تھا اس کے گھونسے میں اتنی طاقت ہوگی۔

کھاکھرے گالی بکتا ہوا گمن سے لپٹ گیا۔ ایڑی مار کر اس نے گمن کو نیچے گرالیا۔ دونوں زمین پر اوپر تلے ہونے لگے۔ بجری کے ڈھیر سے لڑھکتے ہوئے دور تک نیچے چلے گئے۔ گمن غصّے میں دونوں ہاتھ پاؤں چلا کر وار کر رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد کھاکھرے ہانپنے لگا۔ تو اس کا دوست کھاکھرے کی مدد کو پہنچا دونوں مل کر گمن کا مقابلہ کرنے لگے۔ گمن بڑی جیداری سے لڑتا گیا۔ مگر وہ دو تھے اور گمن اکیلا تھا۔ گمن کا پلّہ ہلکا پڑنے لگا۔ دونوں مل کر اسے پیٹنے لگے تو تلسی میدان میں آگئی۔ کبھی وہ ایک کو گھونسا مارتی، کبھی دوسرے سے گھونسا کھاتی، کبھی دانت کٹکٹاتی، کبھی پتھر اٹھا کے مارتی۔ مگر دوسرا آدمی بہت تگڑا تھا۔ اس نے تلسی کو بہت جلد چت کر دیا۔ اور وہ بھی بے دم ہو کر کھاکھرے کے قریب گر پڑی۔ اب لڑائی گمن اور اس تگڑے آدمی کے بیچ ہو رہی تھی۔ گمن ایک دیوانے کی طرح لڑ رہا تھا لگتا تھا جیسے وہ لڑتے لڑتے مر جائے گا۔ مگر ہار نہیں مانے گا۔ اپنے جسم کا آخری زور لگا کے اس نے اس تگڑے آدمی کو زمین پر گرا دیا اور پھر قریب سے ایک بڑا سا پتھر اٹھا کے اس کے سر پہ کھڑا ہو گیا۔

"اب اٹھے تو اس پتھر سے تمہارا سر کچل دوں گا۔" گمن ہانپتے ہانپتے مگر شدید غصّے کے

عالم میں بولا۔

بگڑے آدمی نے گمن کے غضب ناک تیور دیکھ کر ہتھیار ڈال دیئے۔ بیٹھے بیٹھے اپنے دونوں ہاتھ اوپر کر کے بولا..... "سالا اس ٹیم وار و پیا ہے بہت۔ لڑ نہیں سکتا۔ صبح کا ٹیم ہوتا تو تم کو دکھاتا تھا۔ اس ٹیم ہم کو مافی دو۔"

اتنے میں بہت سے مزدور، مرد عورتیں اور بچے بھی جمع ہو گئے تھے۔ کھا کھرے اپنے دوست کو لے کر وہاں سے چلا گیا۔ گمن نے پتھر اپنے ہاتھوں سے نیچے زمین پر پھینک دیا۔

اس رات سفید مونچھوں والے بڈھے نے تلسی اور گمن کو صلاح دی کہ وہ دونوں باہر نہ سوئیں۔ نہ بجری پر، بلکہ بلڈنگ کے اندر گراؤنڈ فلور کے کسی کمرے میں جا کے سو جائیں۔ کیا معلوم یہ لوگ پھر بد معاشی کریں۔ اور دوسرے غنڈوں کو لے کر آئیں۔

ایک کمرے کے اندھیرے فرش پر دونوں لیٹے تھے۔ چپ چاپ.... سمندر کی فاتحانہ گرج گمن کو اپنے دل کی دھڑکن کی بازگشت معلوم ہوتی تھی۔

"گمنے!" تلسی بڑے کمزور لہجے میں بولی۔

"ہاں۔"

"تو میرے لئے کیوں لڑا؟"

"ایسے ہی۔"

"بہت چوٹ کھائی ہے!"

"نہیں تو۔"

"کہاں کہاں چوٹ لگی مجھے بتا دو!"

"کہہ جو رہا ہوں کہیں چوٹ نہیں لگی۔"

"میں پوچھتی ہوں مگنے۔ تم میرے لئے کیوں لڑے؟"

مگن چپ رہا۔ یکایک اس نے محسوس کیا کہ تلسی کا ہاتھ اس کے جسم کو دھیرے دھیرے ٹٹول رہا ہے۔ ہوا کی سرگوشی سے بھی زیادہ کمزور آواز میں وہ بولی.... !

"کیا یہاں چوٹ لگی ہے؟..... کیا یہاں چوٹ لگی ہے؟"

تلسی کی نرم نرم انگلیاں مگن کے جسم کو چھونے لگیں۔

"ارے یہ کیا ہو رہا ہے؟.... یہ کیا ہو رہا ہے؟ مگن اپنے آپ سے پوچھنے لگا: میرا جسم کیوں گرم ہو رہا ہے، زمین سے بخارات اُٹھ رہے ہیں۔ سمندر کا شور اچانک بڑھ گیا ہے۔ دیواریں سانس لے رہی ہیں۔ کسی مسرت آمیز خوشی میں کانپ رہی ہیں۔ مگن کے اپنے ہاتھوں سے چنگاریاں سی اڑتی محسوس ہونے لگیں۔ رگوں میں خون لَو دینے لگا۔ آنکھوں میں شعلے بھڑکنے لگے۔ اس نے بڑی تیزی سے تلسی کو اپنی دونوں باہنوں سے گھسیٹ کر اپنے سینے پر گرا لیا۔ اور جذبات سے گلوگیر آواز میں آتشیں لہجے میں بولا۔

"آ تجھے بتاؤں۔ مجھے کہاں چوٹ لگی ہے۔"

اب وہ اس بلڈنگ سے بہت دور شہر کے دوسرے حصے سے گزر رہے تھے۔ کام کی تلاش میں.... مگن نے تلسی کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ اور وہ دونوں خوش خوش نئے شادی شدہ جوڑے کی طرح ایک دوسرے کیطرف دیکھکر آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراتے ہوئے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ ایک بہت بڑی محل نما عمارت کو دیکھ کر تلسی ٹھٹھک کر رُک گئی۔ حیرت سے دیکھنے لگی۔ "کسی راجہ کا محل معلوم ہوتا ہے۔" مگن اپنے گھر کی عالی شان عمارت کو دیکھ کر زور سے ہنسا۔ بولا: "ہاں۔ مگر اس محل میں سب نامرد رہتے ہیں۔"

اتنا کہہ کر وہ تلسی کو گھسیٹ کر آگے لے گیا۔ محل پیچھے رہ گیا۔ نظروں سے دور ہو گیا۔ ہمیشہ کیلئے....

آدھے گھنٹے کا خدا

دو آدمی اس کا پیچھا کر رہے تھے۔

اتنی بلندی سے وہ دونوں نیچے سپاٹ کھیتوں میں چلتے ہوئے دو چھوٹے سے کھلونوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ دونوں کے کندھوں پر تیلیوں کی طرح باریک رائفلیں رکھی نظر آ رہی تھیں۔ یقیناً ان کا کردار اُسے جان سے مار دینے کا تھا۔ مگر وہ لوگ ابھی اس سے بہت دُور تھے۔ نگاہ کی سیدھ سے اس نے نیچے کی طرف دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں اندازہ کیا۔ جہاں پر میں ہوں، وہاں تک ان دونوں کو پہنچنے میں چار گھنٹے لگیں گے۔ تب تک.....!

اس نے پُرامید نگاہ سے گھوم کر اپنے اوپر پہاڑ کی چوٹی کو دیکھا۔ سارڈُو پہاڑ کی بارہ ہزار فٹ اونچی چوٹی اس سے اب صرف ایک گھنٹے کی مسافت پر تھی۔ ایک دفعہ وہ چوٹی پر پہنچ جائے۔ پھر دونوں کے ہاتھ نہ آسکے گا۔ سارڈُو پہاڑ کی دوسری طرف گڈیالی کا

گھنا جنگل تھا، جو اس کا دیکھا بھالا تھا۔ جس کے چپے چپے سے وہ اتنی ہی آگاہی رکھتا تھا۔ جتنا اس جنگل کا کوئی جنگلی جانور رکھ سکتا ہے۔ اس جنگل کے خفیہ راستے، جانوروں کے بھٹ۔ پانی پینے کے مقام سب اُسے معلوم تھے۔ اگر ایک دفعہ وہ سار دُو پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گیا، تو پھر اپنا پیچھا کرنے والوں کے ہات نہ آسکے گا۔

جب وہ چوٹی پر پہنچ جائے گا تو اسے دوسری طرف کی سرسبز ڈھلوانوں پر گدّیالی کا جنگل دکھائی دے گا اور جنگل سے پرے سرحد کا پُل جسے ڈائنا میٹ لگا کر اڑا دیا گیا تھا۔ گرے ہوئے پُل کے اُس پار اس کا اپنا دیس تھا۔ ایک بار وہ چوٹی پر پہنچ جائے۔ پھر اسے ڈھلوان کے گھنے جنگل کو طے کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔ اگر پُل نہیں ہے تو کیا ہوا۔ وہ بہت عمدہ تیراک ہے۔ وہ گدّیالی ندی عبور کر کے اپنے دیس پہنچ جائے گا۔

اور چوٹی تک پہنچنے میں اسے صرف ایک گھنٹہ لگے گا۔ اور وہ دونوں اس کے دشمن ابھی اس سے چار گھنٹے کی مسافت کے فاصلے پر تھے ـــ نہیں، وہ اُسے نہیں پکڑ سکتے۔ وہ جوان ہے، مضبوط ہے اور چار گھنٹے ان سے پہلے چلا ہے۔ وہ اُسے نہیں پکڑ سکتے۔ وہ ابھی اس چٹان پر پندرہ بیس منٹ بیٹھ کر دم لے سکتا ہے اور وُور نیچے کھیتوں سے گزرتے ہوئے گھاٹیوں کی طرف آنے والوں اُن دونوں آدمیوں کو بڑے اطمینان سے دیکھ سکتا ہے جو اُس کی جان لینے کے لئے آرہے ہیں۔ وہ مسکرا بھی سکتا ہے کیونکہ وہ ان سے بہت دُور ہے۔

یقیناً انہوں نے اسے دیکھ لیا ہے کیونکہ نیچے کے کھیتوں سے چوٹی تک اس طرف کا پہاڑ جس کے اوپر وہ چل رہا ہے بالکل ننگا ہے۔ بس چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں ہیں۔ سینتے کی اور لال ٹمینا کی۔ جن میں آدمی چھپ بھی نہیں سکتا اور زمین سے لگی ہوئی

پتلی چھدری گھاس ہے اور نیچی نیچی سیاہ چٹانیں۔ رات کی بارش سے بھیگی ہوئی اور پرانی کائی سے پھسلواں۔ اس پرانی کائی سے بند پانی کی بُو آتی ہے اور بھربھری مٹی پر قدم پھسلتے ہیں۔ اُسے بڑی ہوشیاری سے آگے کا فاصلہ طے کرنا ہوگا۔ جبھی تو اس نے اس فاصلے کو طے کرنے کے لئے، جو آدھے گھنٹے میں باآسانی طے ہو سکتا ہے۔ ایک گھنٹہ رکھا ہے۔

بس اسے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ وہ نیچے کے گاؤں سے بھاگتے وقت کیوں اپنی رائفل ساتھ نہ لا سکا۔ بھاگتے وقت اس نے رائفل وہیں چھوڑ دی۔ یہ ایک ناقابلِ معافی حادثہ تھا۔ مگر اب کیا کیا جا سکتا تھا؟ — اگر اُس کے پاس، اس وقت اپنی رائفل ہوتی تو وہ دونوں، نیچے سے آنے والے اس قدر بے خوفی سے اُس کا پیچھا نہیں کر سکتے تھے۔ وہ آسانی سے کسی چٹان کی اوٹ میں دبک کر کسی مناسب جگہ پر ان کا انتظار کر سکتا تھا اور اپنی رائفل کی رینج میں آتے دیکھ کر ان لوگوں کو گولی کا نشانہ بنا سکتا تھا۔ مگر وہ کیا کرے۔ اس وقت وہ بالکل نہتا ہے۔ اور اب ہر لحظہ اس کی یہ کوشش ہوگی کہ وہ ان کی بندوق کی مار سے آگے چلتا رہے —!

اُس نے تعاقب کرنے والوں کے پیچھے بھی دور تک کھیتوں کو دیکھا اور کھیتوں سے پرے سیب، آلوچے اور خوبانیوں کے درختوں سے گھرے موگری کے گاؤں کو دیکھا — ایک لمحے کے لئے اس کے دل کے اندر اُداسی کی ایک گہری سُرخ لکیر کھینچتی چلی گئی۔ اس خنجر کی باریک اور تیز دھار کی طرح جس کا پھل اُس وقت موگری کے دل میں پیوست تھا۔ موگری جو سیب کے پھولوں کی طرح خوبصورت تھی!

کاشر کے لئے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ موگری کی جان لے لے۔ چمکتی ہوئی گہری سیاہ

آنکھوں والی موگری۔ انگاروں کی طرح دہکتے ہوئے ہونٹوں والی۔ انیس برس کی موگری۔ وہ جب ہنستی تھی تو ایسا لگتا تھا گویا سیب کی ڈالیوں سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ ایسی مہکتی ہوئی سپید ہنسی اُس نے کسی دوسری لڑکی کے پاس نہ دیکھی تھی، ہنسی جو سیب کے پھولوں کی یاد دلائے۔ یا اچانک پر کھول کر ہوا میں کبوتری کی طرح اُڑ جائے اور وہ ذرا سے کُھلے ذرا سے بند انگاروں کی طرح دہکتے ہوئے شریر ہونٹ۔ ان ہونٹوں پر جب وہ اپنے ہونٹ رکھ دیتا تھا تو اُسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اُس کے خون کے بہاؤ میں چنگاریاں سی اُڑتی چلی جا رہی ہیں جیسے جذبہ پگھل کر خون اور خون پگھل کر شعلہ اور شعلہ پگھل کر بوسہ بن گیا ہو۔ اور وہ پوری طرح موگری کے چہرے پر جھک جاتا تھا۔ اتنے زور سے کہ موگری کی سانس اس کے سینے ہی میں رُکنے لگتی تھی اور وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتوں سے اُس کے منہ پر طمانچے مار کر ہی اپنا چہرہ اُس کے چہرے سے الگ کر سکتی تھی۔

"تم بالکل جانور ہو کاشر! وہ ہانپتے ہوئے کہتی۔

"اور تم آگ ہو!" وہ خود اپنے جذبے کی شدت سے ڈر کر ذرا پیچھے ہٹتا ہوا کہتا۔

"میرے گاؤں میں کوئی نہیں جانتا کہ میں ایک دشمن کے بیٹے سے پیار کرتی ہوں۔"

"میرے سپاہیوں میں سے بھی کوئی نہیں جانتا کہ میں گڈیالی کے جنگل میں روز کسی سے ملنے جاتا ہوں۔"

وہ دونوں گڈیالی کے جنگل میں جیپ کے کسی کچے راستے پر بیٹھ جاتے۔ دیودار کے ایک ٹوٹے ہوئے تنے پر۔ پیچھے جیپ کھڑی ہوتی۔ سامنے ایک چھوٹی سی ڈھلوان کی گھری اور دبیز گھاس۔ کوئی چشمہ تقریباً بے آواز ہو کر بہتا تھا۔ جنگلی پھولوں پر پانی کے قطرے گر گر کر سو جاتے اور چاروں طرف بڑے بڑے ستونوں کی طرح اونچے اونچے دیودار اور ان کے گھنے

چھنتاروں میں سے سبزی مائل روشنی دُور اونچے لٹکے ہوئے فانوسوں کی طرح چھن چھن کر آتی ہوتی۔۔۔۔ کاشر کو ایسا محسوس ہوتا، گویا وہ کسی مغل بادشاہ کے دیوانِ خاص میں بے اجازت آنکلا ہے۔ یہاں اگر وہ دونوں کئی منٹ تک جنگل کے گہرے سناٹے میں کھو جاتے اور آہستہ آہستہ سرگوشیوں میں باتیں کرتے لگتے۔ کبھی ایسا لگتا جیسے سارا جنگل چُپ ہے۔ کبھی ایسا لگتا جیسے سارا جنگل اُن کے اردگرد سرگوشیوں میں باتیں کر رہا ہے۔

موگری علاقہ غیر کے گاؤں سے ایک ٹوکری میں پھل اٹھائے ہوئے گڈیالی کے پُل تک آتی تھی۔ جو کاشر اور اس کے سپاہیوں کی عملداری میں تھا، سیب، ناشپاتی، کیلے، آلوچے، بہی، کیمب، اُودے انگوروں کے گچھے یا صرف اخروٹ اور مکی کے بھٹے اور وہ چھوٹی چھوٹی خوش رنگ خوبانیاں جنھیں دیکھ کر سنہری اشرفیوں کا دھوکا ہوتا ہے اور موگری اتنی خوبصورت تھی کہ پُل کی حفاظت کرنے والے سپاہی چند منٹوں میں اس کی ٹوکری خالی کر دیتے تھے۔ سب سے آخر میں کاشر آتا تھا اور جب کاشر موگری کے نزدیک آتا تھا تو سب سپاہی ہٹ جاتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے ـــــ!

لیکن جس دن موگری کی مخبری پر علاقہ غیر کے گاؤں والوں نے گڈیالی کا پُل جو اسکی تحویل میں تھا، ڈائنامیٹ سے اُڑا دیا، اس دن اُسے شدید دھچکا سا لگا۔ جیسے اس کے اندر بھی کوئی پُل تھا جو ڈائنامیٹ سے پُرزے پُرزے ہو گیا تھا اور وہ باہر کا پُل تو کبھی نہ کبھی پھر بن جائے گا۔ لیکن اندر کا پُل کون بنا سکے گا پھر سے؟ اس لئے وہ دہشت زدہ سا ہو کر پُل کے ٹکڑوں کو اُن گہرے پانیوں میں جاتا ہوا دیکھتا رہا جہاں لطیف سے لطیف جذبے بھی بھاری پتھر بن کر ایسے ڈوب جاتے ہیں کہ پھر کبھی نہیں اُبھر سکتے۔ وہ جانتا تھا مگر اس کی آنکھوں میں آنسو نہ آسکے اور وہ موگری کو گالی دینا چاہتا تھا مگر اس کی زبان پہ الفاظ نہ آسکے۔ وہ جانتا تھا

کہ ہر سپاہی کی نگاہ اُس پر ہے۔ وہ نگاہ جو بظاہر کچھ نہیں کہتی۔ لیکن خاموش لہجے میں شکایت کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ جب وہ ان نگاہوں کی تاب نہ لا سکا تو اپنی رائفل لے کر گڈیالی ندی میں کُود پڑا اور اس کے سپاہی بھونچکے ہو کر اس کی طرف دیکھتے رہ گئے۔

وہ ندی پار کر کے گڈیالی کے جنگل میں گھُس گیا۔ کئی دن تک وہ اکیلا بھوکا پیاسا اس جنگل میں گھومتا رہا اور وہ ان تمام جگہوں پر گیا جہاں پر وہ موگری کے ساتھ گیا تھا اور ان جگہوں پر جا کر اُس نے اُن تمام جذبوں کو بلانا چاہا۔ جنہوں نے موگری کی موجودگی میں اس کے لئے دُھندلے دُھندلے شفق زار تعمیر کئے تھے۔ کئی بار وہ موگری کی عدم موجودگی میں بھی یہاں آیا تھا تو بھی اُسے ہر جگہ موگری کی عدم موجودگی میں بھی اُس کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ وہ پیڑ کا تنا جہاں موگری بیٹھی تھی اُس کے گرد اِک ہالہ سا کھینچا معلوم ہوتا تھا۔ موگری نہ تھی۔ پھر بھی گویا جھرنے کے پانیوں میں اس کی آواز کی روانی گھل گئی تھی۔ ہر پھُول میں اُس کے بالوں کی مہک تھی۔ اور وہ زمین جہاں پر وہ بیٹھتے تھے۔ وہاں سے موگری کے جسم کی سوندھی سوندھی مہک آتی تھی۔

مگر آج وہاں کچھ نہ تھا۔ جذبوں کے شفق زار چھٹ گئے تھے۔ پیڑ کا تنا محض پیڑ کا تنا تھا۔ اور پانی کا جھرنا۔ پانی کے جھرنے کی طرح بہ رہا تھا۔ ہر چیز انجانی اور اجنبی اور اس سے الگ الگ کھڑی تھی۔ وہ چیخ مار کر سارے جنگل کو جگا دینا چاہتا تھا۔ مگر اس کا حلق بار بار گھٹ رہا تھا۔ اس کے سارے احساسات پر اِک دُھندسی چھائی ہوئی تھی، جنگل میں بے سمت گھومتے کئی بار اُسے خیال آیا کہ اگر وہ اس دُھند کو اپنے ناخنوں سے چیر دے تو شاید اندر سے موگری کا زندہ اور اصلی چہرہ صحیح و سلامت نکل آئے گا۔ وہ موگری جسے وہ اپنے دِل سے پہچانتا تھا۔ مگر دُھند کسی طرح نہ چھٹی۔ اور گہری ہوتی گئی۔ جنگل میں اُس کا دم گھٹنے لگا۔ پیڑوں کا گھیرا اس کے لئے تنگ ہونے لگا۔ اُسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے چاروں طرف سے جنگل کے پیڑ جھک کر اُس

پر گرنے والے ہیں۔

پھر وہ گھبرا کر جنگل سے باہر بھاگ نکلا اور گڈیالی کا جنگل طے کر کے وہ سارؤ د پہاڑ کی برفیلی چوٹی کے دوسری طرف اُتر گیا جہاں موگری کا گاؤں تھا۔

کئی دنوں تک وہ بھیس بدلے ہوئے ٹوہ لیتا رہا۔ کسی کو اُس پر شبہ نہ ہوا کیوں کہ اسکی شکل و صورت ایسی تھی جیسی علاقہ کے لوگوں کی ہوتی ہے۔ اس کے کپڑے بھی پھٹے ہوئے تھے، اور وہ اُن کی زبان بخوبی بول سکتا تھا۔ اس لئے کسی کو اس پر شبہ نہ ہوا۔ اور وہ ایک دن موقعہ دیکھ کر آدھی رات کو موگری کے گھر کے اُس کمرے میں گھس گیا جہاں موگری سو رہی تھی۔ موگری کمرے میں اکیلی سو رہی تھی۔ اُس نے آہٹ کئے بغیر کُنڈی اندر سے چڑھا دی۔ رائفل کندے سے اُتار کر ایک کونے میں رکھ دی۔ اور آہستہ آہستہ دُبک دُبک کر وہ موگری کے بستر کے قریب چلا گیا۔ قریب جا کر اُس نے اپنا خنجر نکال لیا۔

وہ خنجر ہات میں لئے دیر تک کھڑا رہا۔ اور موگری کی سانسوں کی پُرسکون آواز سنتا رہا۔ چاروں طرف گھُپ اندھیرا تھا۔ وہ موگری کے چہرے کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کے دِل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ وہ ایک بار ماچس جلا کر موگری کا چہرہ دیکھے۔ مگر بڑی جانکاہ کاوش سے اس نے ایک اذیت ناک خواہش کو اپنے دل میں روک دیا۔ دیر تک وہ خنجر لئے یونہی کھڑا رہا۔ اور موگری کے سانسوں کے اُس بے آواز جھرنے کو سنتا رہا جو اب اُس کے دل کی طرف بہہ رہا تھا۔ وہ ہولے ہولے موگری کے چہرے پر جھک گیا۔ بس ایک الوداعی بوسہ اور پھر خنجر!....

مگر جھکتے جھکتے اس کے سانس کی رفتار تیز ہوتی گئی۔ اس کے دماغ میں سنسناتی ہوئی گونجیں سی چاروں طرف پھیلنے لگیں۔ اور اس نے اپنے جلتے ہوئے، کانپتے ہوئے ہونٹ موگری کے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔

موگری کے سارے جسم میں ارتعاش سا پیدا ہوا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے موگری چیخ مارنے کو ہے۔ مگر اُس نے ایسی مضبوطی سے اپنے ہونٹوں سے بلا رکھا تھا کہ چیخ مارنے کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ پہلے تو موگری کا سارا جسم برف کی طرح سرد ہونے لگا۔ اور ہمیشہ یونہی ہوتا تھا۔ اُسے اس سے پیشتر کے بہت سے رنگین اور خوبصورت لمحے یاد آئے جب موگری پیار کرتے کرتے یک لخت اُس کے بازوؤں میں سرد پڑ جاتی تھی۔ اور کئی لمحوں تک اُس کی یہی کیفیت رہتی تھی جیسے وہ دل و جان سے اُسکی مزاحمت کر رہی ہے۔ پھر ہولے ہولے اُس کے بوسوں کی آنچ سے اُس کا سارا جسم گرم ہونے لگتا۔ ہولے ہولے گویا برف پگھلنے لگتی۔ اور بدن میں انگڑائیاں اور پھریریاں جاگنے لگتیں۔ اور گرم گرم سانس آنچ کی طرح پگھلنے لگتا اور وہ بے اختیار ہو کر کاشر سے لپٹ جاتی اور اپنے بازو اُس کی گردن میں حائل کر دیتی۔ موگری کے دل کے اندر غالباً محبت اور نفرت کا ہر آن بدلتا ہوا میزانیہ سا چلتا رہتا تھا۔ اپنا دشمن سمجھ کر وہ اس سے نفرت کرتی تھی۔ اپنا محبوب سمجھ کر اس سے محبت کرتی تھی۔ اور کبھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی تھی۔

اس وقت بھی یہی ہوا۔ موگری کا سرد پڑتا ہوا خوفزدہ اور اپنے آپ میں اکیلا جسم دھیرے دھیرے لَو دینے لگا۔ جیسے انگ انگ سے روشنی پھوٹ نکلے۔ ایسی روشنی جسے آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔ صرف ہاتھ محسوس کر سکتے ہیں۔ موگری نے یقیناً اُس بوسے کو پہچان لیا تھا۔ خوبصورت اور پُرخطر زندگی بسر کرنے والی عورت کی زندگی میں بہت سے بوسے آتے ہیں۔ دیمک کی طرح چاٹ جانے والے بوسے اور جونک کی طرح چمٹ جانے والے بوسے۔ رُوکھے سُوکھے پاپڑ نما بوسے اور لیسے لجلجے اور گندے بوسے گویا ہونٹوں پر کیڑے چل رہے ہوں۔ شرمائے ہوئے سہمے ہوئے بوسے۔ اور خوفزدہ کمزور اور بیمار بوسے اور صحت مند اور شریر بوسے۔ موگری ایسی

خوبصورت عورتوں کو ہر قسم کے بوسوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ مگر وہ یہ بھی جانتی ہیں کہ ان میں سے کون سا بوسہ ایسا ہوتا ہے جو دل پر دستک دیتا ہے۔ صرف اُسی دستک کے جواب میں وہ بوسے کے جواب میں بوسہ دیتی ہیں۔ ورنہ صرف ہونٹ پیش کرتی ہے۔

مگر اِس بار موگری صرف چند لمحوں کے لئے برف کی طرح ٹھٹھری رہی۔ پھر اُس نے اپنے اوپر جھکے ہوئے ہونٹوں کے لمس کو پہچان لیا اور پہچان کر بھی گو وہ چند لمحوں کے لئے وحشت زدہ اور ٹھٹھری سی رہی، مگر ہوتے ہوتے اُس کی مغائرت دُور ہوتی گئی۔ آدھی رات کے نیم گرم اندھیرے میں کسی غیر متوقع خوشی سے اُس کی ساری روح کانپ اُٹھی۔ اور وہ خود سے کاشر کی باہنوں میں آگئی۔ اور اس طرح آئی جیسے اب تک کبھی نہ آئی تھی۔ کاشر نے محسوس کیا جیسے آسمان زمین پر اُتر آیا ہو۔ اور زمین لمبے لمبے سانس لے کر ہانپنے لگی۔ ایک شعلہ سا تھا جو برف کی پنہائی میں ڈوب رہا تھا، برف کی ٹوٹتی ہوئی ٹکڑیاں۔ گلاب کی بکھری ہوئی پتیاں۔ رسک رسک کر سُلگتا ہوا سنگیت ...... جسم کے حصار کو توڑنے کی کاوش میں اُفتاں وخیزاں۔ یکایک حصار ٹوٹ گیا...... مچھلیاں طوفان میں بہ گئیں۔ بہت سارے چراغ اِک دم گُل ہو گئے۔ پھر سارے احساس نیم غنودگی کی سبز جھیل میں کھو گئے......

جب وہ جاگا تو اسی طرح گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اور موگری اس کی باہنوں میں بے خبر سو رہی تھی۔ جانے اس بے خبری میں کب کاشر نے خود اپنے ہات کا خنجر اپنے پہلو میں رکھ لیا تھا......!

اس نے پہلو بدل کر آہستہ سے خنجر نکالا۔ آہستہ سے موگری نیند میں کسمسائی۔ جھکے ہوئے کاشر کو موگری کا ہات اپنی پیٹھ پر محسوس ہوا، تھپکتا ہوا۔ نیند کی ترغیب دیتا ہوا۔ پیشتر اس کے کہ وہ پھر اپنے جذبات کے دھارے میں بہ جائے اُس نے ایک ہی جھٹکے سے پورا خنجر ہتھی تک

موگری کے دل میں اتار دیا۔

موگری چیخ بھی نہ سکی۔ ہولے ہولے اس کا کانپتا ہوا جسم ٹھنڈا ہوتا گیا۔ مگر کاشر نے موگری کو بہت دیر تک اپنے جسم سے الگ نہیں کیا۔ ہولے ہولے کاشر کے جسم نے موگری کے مرتے ہوئے جسم کے ہرار تعاش کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ اور جب موگری کا جسم بالکل ٹھنڈا ہو گیا۔ تو اُس نے موگری کے جسم کو اپنے جسم سے الگ کر دیا۔ اس کے ٹھنڈے ہونٹوں کو پھر اس طرح بوسہ دیا جیسے وہ اُنہ کو بوسہ دے رہا ہو۔ پھر کنڈی کھول کر باہر آنگن میں آیا۔ اور تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے وہ آنگن کی دیوار پھلانگ کر ایک احمق کی طرح سرپٹ بھاگنے لگا۔ کیوں کہ اب اس کے دماغ کی ہر رگ اور نس تانبے کے تاروں کی طرح جھنجھنا رہی تھی اور جسم کے روئیں روئیں میں خطرے کی گھنٹیاں بج رہی تھیں...... یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ سارا گاؤں نیند میں ڈوبا ہوا سو رہا تھا۔ کسی نے اُس کے جسم میں بجتی ہوئی خطرے کی گھنٹیوں کی پُرشور صدا کو نہیں سنا۔ اور وہ کھیتوں سے نکل کر سارُود پہاڑ کی چڑھائی چڑھنے لگا۔ صبح جب موگری کے بھائیوں نے موگری کی لاش دیکھی۔ اور دیوار سے لگی ہوئی رائفل کو پہچانا تو اس کا تعاقب کیا۔ مگر اب تک اسے چار گھنٹے کا سٹارٹ مل چکا تھا۔

اتنی دوری سے وہ انہیں دیکھ سکتا تھا۔ موگری کے دونوں بھائی برابر قدم سے قدم ملائے تیز تیز چل رہے تھے۔ وہ موگری کے بھائیوں کو جانتا تھا۔ وہ دونوں بہادر اور جری۔ دلیر اور جفاکش تھے۔ اُس کی طرح پُرخطر زندگی کے عادی تھے۔ مستقل مزاج، غیور اور انتقام پسند تھے۔ وہ ان سے کسی رحم کی توقع نہ کر سکتا تھا۔ درخواست بھی نہ کر سکتا تھا۔ پہلی بات ان کے کردار کے خلاف ہوتی۔ دوسری اس کے اپنے مزاج کو ناپسند ہوتی۔ اگر رائفل اس کے ہات میں ہوتی تو وہ اُن دونوں کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ وہ اتنا فاصلہ ضرور رکھے گا کہ کسی طرح اُن کی رائفل کی زد میں نہ آسکے وہ دونوں بہت تیزی سے منجھے ہوئے مشاق پہاڑی خچروں کی طرح چل رہے تھے۔ وہ بھی برابر

یکساں لے میں چھوٹے چھوٹے سانس لیتا ہوا سارُود کے اوپر چڑھ رہا تھا۔ مگر فاصلہ دھیرے دھیرے کم ہو رہا تھا کیونکہ وہ دونوں کھیتوں میں تھے۔ سیدھے اور سپاٹ راستے پر۔ اور وہ پھسلواں چڑھائی پر جہاں کائی لگی چٹانیں تھیں اور بھربھری مٹی۔ اور کل رات کو جب وہ موگری کی آغوش میں تھا کسی وقت سارُود پہاڑ کی اونچائی پر بارش ہو چکی تھی۔ اور سارا پہاڑ گیلا تھا۔ اور بھُربھُری مٹی میں دھنسی ہوئی چٹانیں اپنی جگہ سے ہلتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اور اُسے ہر قدم نہایت احتیاط سے اور پھونک پھونک کر رکھنا پڑتا تھا۔ اور جگہ جگہ رُک کر ایک لمحے کے لئے پیچھے مڑ کر بھی دیکھنا پڑتا تھا کہ وہ دونوں کہاں ہیں اور کتنے فاصلے پر ہیں۔ پہاڑ اس قدر ننگا تھا کہ دونوں فریق ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے۔ اور لمحہ بہ لمحہ اس تعاقب کا اندازہ کر سکتے تھے۔ بھاگنے والا بھی اور پیچھا کرنے والا بھی۔ دونوں اس تعاقب میں برابر ایک دوسرے کو نگاہ میں رکھنے پر مجبور تھے۔

دھیرے دھیرے صبح کے سپید سنہرے اور گلابی پردے آسمان سے سرکا دیئے گئے اور سُورج فلک کی نیلگوں کھڑکیوں سے نیچے جھانکنے لگا۔ دھیرے دھیرے اُس کی روشنی تیز سخت گیر اور بے رحم ہوتی گئی۔ اور کاشر کو احساس ہونے لگا گویا سورج بھی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ اس کی گردن چہرے اور پیٹھ سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ روشنی اُسے اپنی پلکوں پر بیٹھی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ اور کرنوں کے کوڑے متواتر اُس کے جسم پر پڑنے لگے۔ اور پیاس سے حلق میں کانٹے سے چبھنے لگے۔ تو بھی وہ چلتا رہا۔ چلتا رہا۔ چلتا رہا۔ ساری صبح چلتا رہا۔ ساری دوپہر چلتا رہا۔ کبھی تیز۔ کبھی مدھم۔ کبھی مضبوط قدموں سے کبھی تھکے بھاری قدموں سے۔ ایک لمحہ رُکے بغیر چلتا رہا۔ پیاس نے اُس کا حلق بالکل خشک کر دیا تھا۔ گال، زبان، تالو، کاگ اور نرخرے میں ایسا لگتا تھا گویا کہیں سے خاردار جھاڑیاں اُگ آئی ہیں۔ اور ہوا کی نالی سے ہوا یوں

اندر باہر جاتی تھی جیسے لوہار کی خشک اور سخت کھُردرے چمڑے والی دھونکنی سے نکلتی ہے۔ اب ہوا کی دھار تک کانٹے کی طرح تیز اور نکیلی تھی۔ تو بھی وہ چلتا رہا۔ کیوں کہ وہ رُک نہ سکتا تھا، کیوں کہ اس کا تعاقب کرنے والے بھی کہیں ایک لمحے کے لئے نہیں رُکے تھے۔ چلتے چلتے جب وہ سارود پہاڑ کا تین چوتھائی سے زیادہ فاصلہ طے کر گیا۔ اور جب اُسے سارُد پہاڑ کی برفیلی چوٹی اُونچی اُونچی لمبی چٹانوں سے گھری ہوئی اپنے سر کے اُوپر نظر آنے لگی۔ اور وہ سپید سپید بادل جو اُس کے بالکل نزدیک منڈلا رہے تھے اس کے کندھوں کو چھُوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ تو اس نے چند لمحوں کیلئے آرام کرنا برحق جانا۔ اور خطرے سے خالی بھی۔ اور وہ لڑکھڑاتا ہوا بالکل مجبُور ہو کر چٹانوں میں دبے ہوئے ایک چھوٹے سے چشمے پر جُھک گیا۔ اور جانوروں کی طرح ڈیک لگا کر پانی پینے لگا۔ پانی پیتے پیتے اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو بیچ ہی میں روک کر نگاہ گھُما کر نیچے کی طرف دیکھا۔ اس کے تعاقب کرنے والے پہاڑ کا راستہ آدھے سے زیادہ طے کر چکے تھے پھر بھی وہ کافی عرصے کے لئے خطرے سے باہر تھا۔ اور اب چوٹی دو ہزار فٹ کے فاصلے پر گویا اُس کے سر کے اُوپر اطمینان کا سایہ کئے کھڑی تھی۔ ایک جست اور...... اور پھر وہ خطرے سے باہر تھا۔ ایک دفعہ وہ چوٹی پر پہنچ جائے پھر گڈیالی کے جنگل میں اسے کوئی نہیں پکڑ سکے گا۔

یہ خیال آتے ہی اس نے اطمینان کا ایک سانس لیا۔ اور اپنا چہرہ سارے کا سارا چشمے کے پانی میں ڈبا دیا۔ پانی پی کر اُس کا تنا ہوا گرم جسم ایک دم گویا سیراب ہو گیا۔ ڈھیلا پڑ گیا۔ اُس نے اپنی آنکھیں بڑے اطمینان سے بند کر لیں۔ وہ وہیں چشمے کے کنارے اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑ کر ٹانگیں پسار کے پڑ گیا۔ اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور چند منٹ کے لئے ستانے کے لئے ایک نیم غنودگی کے عالم میں کھو گیا۔ ابھی تھوڑی دیر کے بعد بس چند منٹ

کے بعد وہ تازہ دم ہو کے اُٹھے گا۔ اور پہاڑ کا آخری حصّہ طے کر کے چوٹی پر ہو گا اور خطرے سے باہر پہنچ جائے گا۔

وہ یونہی چند منٹ کے لئے اسی نیم غنودگی کے عالم میں سستاتا رہا۔ چند منٹ کے لئے اُس کے جسم کو جو آرام ملا تو اُس کے دِل سے وقت کا احساس زائل ہو گیا۔ آرام کا ایک گنگنا تھپکنے والا نشہ تھا جو اُس کے جسم و جان میں اُترا جا رہا تھا۔ اُسی عالم میں اُس نے پہلے دو ایک منٹ میں چوٹی کی بُھربُھری مٹی سے پھسل کر گرنے والی چٹانوں کی ایوالانش کی آواز نہیں سُنی۔ پھر جب یکایک بڑھتی ہوئی گڑگڑاہٹ کی وہ آواز اُس کے کانوں میں آنے لگی تو وہ چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ پھر وہ خوف اور دہشت کی ایک چیخ مار کر چشمے سے ہٹا اور چوٹی سے گرنے والے ہزاروں ٹن مٹی اور چٹانوں کے خوفناک تیزی سے نیچے کو بھاگتے ہوئے ملبے سے اپنی جان بچانے کے لئے ایک طرف کو بھاگا۔ بھاگتے بھاگتے بھی وہ اپنے آپ کو اُس خوفناک ایوالانش کی زد سے نہ بچ سکا۔ ہزاروں توپوں کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ ایک طوفان خیز زلزلہ سا گویا اُس کے سر کے قریب سے گزرا اور وہ زمین پر بچھ گیا۔ اُسے اپنے حلق میں اور نتھنوں میں اور سانس کی نالی میں مٹی کے ذرّے گھستے ہوئے محسوس ہوئے اور ایک خوفناک کڑک سے ساری زمین کانپتی ہوئی محسوس ہوئی۔ پھر کوئی انتہائی سخت سی چیز اس کی ٹانگوں سے ٹکرائی جیسے کسی نے بڑے زور سے کوئی آہنی ہتھوڑا اُس کے دھڑ پر گرایا ہو۔ اور وہ بے ہوش ہو گیا۔

جب وہ ہوش میں آیا تو چند لمحوں تک اُسے یہ احساس رہا جیسے کہ وہ مر چکا ہے۔ اور کسی گہری قبر میں دفن ہے۔ اُس کے چاروں طرف دائیں بائیں اُوپر نیچے مٹی کنکر روڑے اور چھوٹی چھوٹی چٹانیں پڑی تھیں اور وہ ان میں اوندھا لیٹا تھا۔ پھر اُس نے آنکھیں

کھول کر دیکھنے کی کوشش کی تو اُسے اپنے دونوں ہات نظر آئے جو مٹی میں دھنسے تھے۔ اُس نے پہلے تو بڑی حیرت سے اپنے ہاتوں کو دیکھا۔ پھر آہستہ سے انہیں ہلایا۔ جب وہ ہلنے لگے تو اس کا اچنبھا دُور ہوتا گیا۔ اُسے یقین آ گیا کہ وہ زندہ ہے۔ اُس نے بڑی کوشش سے لیٹے لیٹے پہلے اپنے دائیں ہات کو مٹی اور کنکر کے ڈھیر سے آزاد کیا۔ پھر دوسرے ہات کو۔ پھر مٹی کھود کر اُس نے اپنے دھڑ کو آزاد کرایا۔ پھر اپنی بائیں ٹانگ کو۔ پھر جب وہ کسمسا کر اور کروٹ لینے کے انداز میں دائیں ٹانگ کو آزاد کرانے کے لیے زور لگانے لگا جو ایک بڑی چٹان کے نیچے دبی تھی تو شدید درد اور اذیت کی ایک زور کی چیخ اُس کے حلق سے نکل گئی اور وہ اپنی کوشش میں ناکام ہو کر وہیں زمین پر پڑے پڑے ہانپنے لگا۔

جہاں وہ لیٹا تھا۔ اور جس زاویے سے وہ لیٹا تھا وہاں سے اُسے پہاڑ کے نچلے حصے کا منظر بخوبی دکھائی دیتا تھا۔ وہ دیکھ سکتا تھا کہ ایوالانش کا بھاری ملبہ اس کے جسم سے بس چند فٹ کے فاصلے سے ہو کر گزرا ہے۔ چند لمحوں کی دیر ہو جاتی تو اُس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے اُڑ جاتے۔ یا چند لمحے اگر وہ خبردار ہو جاتا تو اس ایوالانش سے وہ صاف بچ جاتا ...... اُس نے دُور تک پہنچے ایوالانش کے راستے کو دیکھا۔ ایوالانش جہاں جہاں سے گزری تھی جھاڑیوں کو اُکھاڑتی ہوئی ٹیلوں کو مسمار کرتی، چٹانوں کو بہاتی اک گہری کھائی بناتی ہوئی گزر گئی تھی۔ اک لمحے کے لیے اُس کے دل میں یہ اطمینان بخش خیال آیا کہ وہ دونوں مر گئے ہوں گے۔ اس ایوالانش کی زد میں آ کر لاکھوں ٹن مٹی کے نیچے اُن کے جسم دب گئے ہوں گے۔ دوسرے لمحے میں اُس نے دیکھا کہ نیچے ایک چٹان کی اوٹ سے وہ دونوں بھائی صحیح و سلامت نکل رہے ہیں۔ رائفلیں اُٹھائے ہوئے اور بڑی احتیاط سے پگ دھرتے ہوئے اپنی آنکھوں پر بار بار ہات رکھ کر اُوپر کا راستہ دیکھتے ہوئے چلے

آ رہے ہیں۔ اس کے چہرے پر ایک تلخ سی مسکراہٹ آگئی۔

اپنے جسم و جان کا پورا زور لگا کر اُس نے اپنی دائیں ٹانگ کو بھی اس بھاری چٹان سے آزاد کرا لیا۔ چٹان جو لُڑھکی تو دیر تک نیچے کو گڑ گڑاتی ہوئی اُتر گئی۔ اُس کی آواز سے نیچے تعاقب کرنے والے چونکے اور انہوں نے اسے بڑھتے ہوئے دیکھ لیا۔ مگر ابھی تک وہ بہت نیچے تھے۔ اور وہ اُن کی رائفل کی زد سے باہر تھا۔

اپنے بائیں گھٹنے پر پورا زور دے کر وہ ہمت سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ مگر پہلا قدم لیتے ہی لڑکھڑا کر گر پڑا۔ اُس کی دائیں ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی۔ بالکل شکستہ ہو چکی تھی۔ اور اُس کے دھڑ کے اندر خطرناک ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ اور اب وہ چل نہ سکتا تھا۔ تو بھی وہ کوشش کر کے پھر اُٹھا اور اپنی دائیں ٹانگ کو اٹھائے ہوئے ایک ہی ٹانگ سے راستے پر پھلانگ پھلانگ کر چلنے کی کوشش کرنے لگا۔ یقیناً نیچے تعاقب کرنے والوں نے اُسے دیکھ لیا تھا۔ اور اب تیز تیز قدموں سے اُس کا تعاقب کر رہے تھے۔ وہ دانت پیس پیس کر پھلانگ پھلانگ کر آگے بڑھتا رہا۔ مگر درد لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہا تھا۔ اور وہ بیچ بیچ میں مجبور ہو جاتا کہ کسی چٹان پر بیٹھ کر جانوروں کی طرح ہانپ لے۔ درد کی ٹیسیں بڑھ رہی تھیں۔ اس کا سارا جسم اک کربناک اذیت سے کانپ رہا تھا۔ اور فاصلہ کم ہو رہا تھا۔ وہ دونوں نزدیک آ رہے تھے۔ نزدیک ہوتے جا رہے تھے۔ وہ پھلانگتے پھلانگتے تقریباً دوڑنے لگا۔ بڑی نابرابر دوڑ تھی۔ مگر وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اگر ایک لحظہ کے لیے بھی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کو زمین پر رکھتا تو آگ اور تیزاب کی ملی جُلی جلتی ہوئی کیفیت سے دوچار ہوتا۔ اور فوراً اپنی ٹوٹی ہوئی ٹانگ اُوپر اُٹھا لیتا۔ پھلانگتے پھلانگتے وہ ہزار بارہ سو فٹ اور اُوپر بڑھ آیا۔ چوٹی اب اُس سے صرف پانچ سات سو فٹ کے فاصلے پر تھی۔ مگر اب وہ بالکل بے دم ہو چکا تھا۔ اس کے جسم میں چھُریاں سی چل

رہی تھیں۔ بار بار اس پر نیم غشی کے دورے سے پڑتے اور آنکھوں میں تو مرے سے ناچنے لگتے۔ اب اُس نے محسوس کیا کہ اس کا دھڑ بالکل بے کار ہو چکا ہے۔ اب وہ بالکل نہیں چل سکتا۔ کسی نہ کسی طرح زور لگا کر اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی۔ جب اُس میں ناکام ہوا تو اُس نے سر نیچا کر کے لیٹے لیٹے ہی گھسٹنا شروع کر دیا۔ اُوپر کی طرف اپنے بازوؤں کی قوت سے وہ ہر فٹ اُوپر ہی اُوپر گھسٹتا رہا۔ اس گھسٹنے میں اُس کے گھٹنے چھل گئے۔ اس کی کہنیوں سے خون بہنے لگا۔ ہاتوں کی اُنگلیاں چھلنی ہوتی گئیں۔ اس کے شانے چھل گئے۔ پھر بھی وہ لمحہ بہ لمحہ آگے ہی کو اُوپر کو ہی گھسٹتا رہا۔ ساری زندگی کی کاوش اور اُمید اور محنت اور اس کا درد اور انتظار اُس کی آنکھوں میں کھنچ آیا تھا۔ اور وہ اپنے جسم سے نہیں بلکہ اپنی آنکھوں سے چلتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ آخری سو فٹ ......اب اُس نے پیچھے کو دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ آخری پچاس فٹ ...... آخری تیس فٹ ..... وہ اُوپر ہی اُوپر گھسٹتا گیا۔ پھر دانت پیس کر اور اپنے جسم سے زیادہ اپنی روح کا پورا زور لگا کر اور اپنی حیات کی مخفی قوتوں کو آواز دے کر اُس نے آخری تیس فٹ بھی اِنچ اِنچ گھسٹ کر طے کر لئے۔ اور پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی پر پہنچ گیا۔ جو تعاقب کرنے والوں کی طرف سیدھی بلّم کی طرح کھڑی تھی۔ لیکن گڈیالی کے جنگل کی طرف ایک آرام کرسی کی طرح ڈھلوان شکل اختیار کئے ہوئے تھی۔

چوٹی پر پہنچ کر اُس نے اپنے آپ کو اس چٹان کی اُونچی آرام کرسی پر گرا دیا۔ اور ہانپتے ہانپتے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

جب اُس نے اپنی آنکھیں کھولیں تو گڈیالی کا سرسبز اور گھنا جنگل دُور نیچے تک اس کے قدموں میں پھیلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ندی کے پار اس کے اپنے دیس میں آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ اور دُور دُور تک اُفق تا اُفق اس کے دیس کی گھاٹیاں اور وادیاں۔ دھان کے

کھیت اور لہراتی ہوئی ندیاں ایک نارنجی غبار میں کھو گئیں تھیں۔ اور جہاں پر کبھی پُل تھا وہاں پر دھنک کی محراب پھیلی ہوئی تھی۔ وہ دیر تک حیرت سے خوبصورت رنگوں کی اس نازک سی محراب کو دیکھتا رہا جو اس کے دل کے سپنوں کی طرح حسین تھی۔ اور یکایک اسے احساس ہوا جیسے اس کے سفر کی آخری منزل آگئی۔ اب جس جگہ پر وہ پڑا ہے۔ وہاں سے وہ ایک انچ اِدھر اُدھر حرکت نہیں کر سکتا۔ وہ چوٹی پر پہنچ گیا تھا۔ اور اس کے جسم نے اُسے آخری جواب دے دیا تھا۔

اُس نے سر کی ایک ہلکی سی جنبش سے ٹوٹے ہوئے پُل کے کنارے اپنے وطن کے سپاہیوں کو سلام کیا۔ اور پھر آنکھ کے کنارے سے نیچے دوسری طرف پہاڑ پر چڑھنے والے سوگری کے دو بھائیوں کو آتے دیکھا۔ اب وہ اُن کی رائفل کی زد میں تھا۔ مگر وہ اُسے مار نہیں سکتے تھے۔ کیونکہ اس کی پیٹھ پر ایک مضبوط دبیز چٹان تھی۔ اُنہیں اُسے مارنے کے لئے چوٹی تک آنا ہو گا۔ اور چوٹی تک آنے میں اُنہیں ابھی آدھ گھنٹہ اور لگے گا۔

چند لمحوں میں وہ بہت دُور اپنے بچپن کو لوٹ گیا۔ اور ان پہلے چند لمحوں میں اُسے اپنے بچپن کے، اپنے گاؤں کے پہاڑ یاد آئے۔ اُونچے ٹیڑھے میڑھے رستے۔ موڑ پر کھڑے ہوئے اچانک اجنبیوں کی طرح نظر آجانے والے دیودار اور ندیاں شریر چرواہوں کی طرح گھاٹی پر دوڑتی ہوئی اور دُھوپ کا آنچل دھیرے دھیرے کسی وادی کے رُخ پر سرکتا ہوا۔ اور خوشبو، تاریک شاموں کی، جن میں ننھے ننھے چراغ رات کے دھیمے سُروں کی طرح جگمگاتے ہیں۔ اور محبت کی سرگوشی کی طرح مہکتے ہیں۔ چند لمحوں کے لئے وہ بہت دُور وہاں لوٹ گیا جو اُس کی ابتدا تھی۔

پھر ابتدا سے وہ جو پلٹا تو اگلے چند لمحوں میں اپنی پوری زندگی پھلانگ گیا۔ اور یکایک

اُسے محسوس ہوا کہ اب تک اُس نے جتنی زندگی گزاری وہ دوسروں کے لئے تھی۔ موگری کی پہلی وفا کے لئے۔ اور اس کی آخری بے وفائی کے لئے۔ اپنے ملک کی محبت کے لئے۔ اور اس کے آخری انتقام کے لئے اور آخر میں اُس خندق کے لئے جو دلوں کو دلوں سے جُدا کرتی ہے۔ قطرہ قطرہ کر کے جب اُس نے اپنی زندگی کا سارا حساب چُکا دیا تو اُسے محسوس ہوا کہ اس کے پاس صرف یہی آدھ گھنٹہ بچا ہے۔ جو مکمل طور پر اس کا اپنا تھا۔

مگر آدھ گھنٹہ تو بہت ہوتا ہے۔ وہ تو ایک طویل عرصہ ہوتا ہے۔ اس عرصے میں وہ بہت کچھ کر سکتا ہے۔ وہ دونوں ہات پھیلا کر آسمان سے گلے مل سکتا ہے۔ زمین پر کھِلے ہوئے بسنتی پھولوں کو سُونگھ سکتا ہے۔ ہوا میں اُڑتی ہوئی نازک بدن ابابیل اور زمین پر چلتی ہوئی کنواری ندی کو دیکھ سکتا ہے۔ اس آدھے گھنٹے میں وہ ایک پوری زندگی گزار سکتا ہے۔ آدھ گھنٹہ تو بہت ہوتا ہے۔!

اور جب اس نے یوں محسوس کیا تو ایسا لگا جیسے وہ ابھی ابھی پیدا ہوا ہے۔

یکایک اُس کے سارے جسم سے درد نکل گیا۔ اس نے اپنے آپ کو بالکل ایک نوزائیدہ بچے کی طرح ہلکا پھلکا اور معصوم محسوس کیا۔ یکایک اس کا جی چاہا کہ وہ باہیں پھیلا کر زور سے قہقہہ لگائے۔ ایسا خوش نصیب آدھ گھنٹہ کس کی زندگی میں آیا ہوگا۔ شروع سے آخر تک اُس کا اپنا۔ اس کے آغاز سے انجام تک مکمل باخبر۔ اس آدھ گھنٹے میں وہ اپنی تقدیر پر پُوری طرح قادر تھا۔ وہ اس آدھے گھنٹے کا خدا تھا۔

مسرت کی ایک لہر اُس کے دل میں دوڑ گئی۔ اس نے بڑے اطمینان سے اپنی ٹانگیں پسار دیں۔ اپنے جسم کو بالکل ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اور دونوں آنکھیں بند کر کے موگری کے بھائیوں کا انتظار کرنے لگا۔

تانی

تلسی بائی کے ہونٹ خوف سے پیلے پڑ گئے تھے اس کی آواز میں سوکھے پتوں کی لرزش تھی۔ اور یہ سوچ سوچ کر اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا رہا تھا کہ اگر عائشہ بی نے بھی انکار کر دیا تو پھر وہ کیا کرے گی؟ کس کے پاس جائے گی؟ اس کے لئے تلسی بائی نے ہاتھ جوڑ کر، گڑگڑاتے ہوئے عائشہ بی سے کہا۔

"بائی میری تانی دس روز سے بیمار ہے۔ اس کا بخار ٹوٹتا ہی نہیں۔ دس روپے ادھار دے دو۔ پگار میں سے کاٹ لینا۔"

عائشہ نے ناں تو نہ کی، لیکن بولی "تیری پگار اکیس روپے ہے نا؟ تو مجھ سے نو روپے ادھار لے چکی ہے اب تک۔ اسی مہینے میں۔ ہے نا؟

تلسی نے سر ہلا کر ہاں کہا۔

"اچھا اب دس روپے اور لے لے گی، تو ہو جائیں گے انیس ۱۹۔ ٹھیک؟ عائشہ نے کہا۔

"ٹھیک؟" تلسی نے بڑھتی ہوئی مایوسی سے کہا۔

"تو گویا مہینہ ختم ہونے کے بعد تجھے اکیس کے بجائے صرف دو روپے ملیں گے۔ کیونکہ انیس تو لے چکی ہو گی۔ اب اچھی طرح سے سوچ لے اور پھر ادھار مانگ!"

تلسی بائی نے سوچا۔ مجھے آج اپنی بیٹی کے علاج کے لئے روپوں کی ضرورت ہے۔ مہینہ ختم ہونے کے بعد پھر ضرورت ہو گی تب میں کیا کروں گی؟ میں نہیں جانتی۔ آگے بھی اندھیرا ہے۔ اس وقت بھی اندھیرا ہے۔ پر یہ مصیبت کا سمے تو ٹل جائے۔ میری بیٹی کسی طرح اچھی ہو جائے۔ آگے میں دیکھ لوں گی۔ مگر آگے بھی کیا دیکھوں گی؟ عائشہ بی تو کہتی ہیں۔ مگر ٹھیک کہنے سے کیا یہ مصیبت ٹل سکتی ہے۔ دس روپے تو لینے ہوں گے اُدھار، اور اگلے ماہ پھر لینے ہوں گے۔ اس لئے آج کی مصیبت اور آنے والی مصیبت دونوں کے درمیان توازن پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے تلسی نے پھر بڑی عاجزی سے کہا۔

"تو مالکن تھوڑا تھوڑا کر کے چار پانچ مہینوں میں کاٹ لینا۔" تلسی نے گھبرا کر کہا۔ وہ محنت کرنے والی خوددار عورت تھی۔ اس طرح مانگنے سے اسے شرم بھی آ رہی تھی اور اپنے آپ پر غصہ بھی۔ عائشہ پر بھی اسے غصہ آ رہا تھا۔ وہ سمجھتی کیوں نہیں، اس کی ضرورت کیا ہے؟ عائشہ کے بٹوے میں ہمیشہ نوٹ بھرے کیوں رہتے ہیں؟ اور دن رات کام کرنے کے بعد بھی تلسی کی جیب کیوں خالی رہتی ہے؟ مانگنا کتنا مشکل کام ہے۔ جی چاہتا ہے کسی کا گلا گھونٹ دوں۔ مگر اپنے غصہ کو دباتے دباتے تلسی بائی کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے گھٹے ہوئے غم اور غصے کے تلخ آنسو، انہیں دیکھ کر عائشہ کا دل پگھلنے لگا۔ بائی اچھی عورت ہے۔ روز روز تو مانگتی نہیں ضرور اس کی بیٹی بیمار ہے۔ یہ بہانے کر کے ادھار لے جانے والی عورت نہیں ہے۔ ویسے

آج کل دنیا میں کسی کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ کب سچ بول رہا ہے کوئی؟ کب جھوٹ، دس روپے دے دینے میں کیا حرج ہے؟ تین مہینوں میں کاٹ لوں گی۔

تلسی بائی ہاتھ جوڑے مجبور لہجے میں کہہ رہی تھی" میں نہ مانگتی۔ مگر میرا گھر والا تم جانتی ہو تین دن سے کام پر نہیں گیا۔ شراب پی کر دھت پڑا ہے۔ جاگتا ہے تو اور شراب مانگتا ہے۔ یا مستی میں آکر مجھے پیٹنے لگتا ہے۔ یہ دیکھو!"

تلسی بائی اپنے جسم کے نیل دکھانے لگی" اب اسے کیا کہوں؟" تلسی بائی نے اپنی ساڑھی کے پلّو کے ایک چھوٹے سے کونے سے اپنے آنسو پونچھے۔

عائشہ نے اپنے بٹوے میں ہاتھ ڈال کر دس کا نوٹ نکالا اور تلسی بائی کے حوالے کرتے ہوئے کہا" لو یہ دس روپے تین مہینے میں کاٹ لوں گی"

" اچھا" کہہ کر تلسی بائی وہاں سے بھاگی۔ وہ گھر سے نکل کر باہر سڑک پر آگئی۔ نوٹ کو غور سے دیکھا جیسے اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آرہا تھا۔ کانپتی ہوئی انگلیاں اسے ٹٹول رہی تھیں جیسے ماں پیار سے اپنے بچے کا جسم ٹٹولتی ہے۔ پھر اس نے نوٹ کو اپنے سینے سے لگالیا۔ اپنے ہونٹوں سے لگالیا۔ اپنے ماتھے سے لگالیا جیسے یہ دس کا نوٹ نہیں ہے، تانی کی زندگی تلسی کی ممتا کی آخری امید ہے پھر وہ سڑک پار کرکے سامنے کے جھونپڑوں کی طرف دوڑنے لگی۔ کیونکہ دوا کا نسخہ تانی کے بستر کے نیچے پڑا تھا اس کا جھونپڑا چھ فٹ لمبا۔ پانچ فٹ چوڑا چار فٹ اونچا تھا اس میں بہت جھک کر داخل ہونا پڑتا تھا داخل ہونے سے پہلے تلسی نے نوٹ کو تہہ کرکے اپنی چولی میں چھپالیا اور گھٹنوں کے بل ہوکر وہ اپنے جھونپڑے میں داخل ہوئی۔ اس کا گھر والا گھڑے سے پانی نکال کر مٹی کے ایک کوزے میں پی رہا تھا۔ ایک کونے میں تانی بخار سے پھنک رہی تھی۔ تلسی نے گھبرا کر اپنی بیٹی کے پنڈے کو ہاتھ لگایا پھر

فوراً ہی ہاتھ کھینچ لیا۔ آگ کی طرح تپ رہی تھی تانی۔ اور آنکھیں اوپر کو چڑھ گئی تھیں گھرا کر اس نے سینے پر دوہتر مارا۔ بولی۔

"تین دن سے شراب میں دھت پڑے ہو اور لڑکی کا یہ حال ہو گیا ہے۔ مگر تمہیں گھر کی فکر ہی نہیں ہے۔ کھاکرے۔"

کھاکرے نے مٹی کا کوزہ گھڑے میں اٹار کھ دیا۔ گھٹنوں کے بل پر چلتا ہوا لڑکی کے پاس آیا اس کے سر اور رنڈے پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ دیر تک کچھ سوچتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں شرمندگی کا ایک عجیب سا احساس تھا۔ نرمی سے بولا۔

"ٹھیکیدار سے ایڈوانس مانگتا ہوں۔"

"ٹھیکیدار سے جا کر ایڈوانس مانگتا ہوں؟" کھاکرے کا منہ چڑاتے ہوئے بولی "تیس روپے پہلے سے ایڈوانس لے چکے ہو۔ اب وہ تمہیں کیوں دے گا؟ تم بیٹھو یہیں لڑکی کو دیکھو۔ میں کہیں نہ کہیں سے بندوبست کر کے دوا لاتی ہوں۔ اتنا کہہ کر تلسی نے تانی کے بستر کے نیچے سے دوا کا نسخہ نکالا۔ کھاکرے نے تلسی کو شبہے کی نظروں سے دیکھا۔ گھٹنوں کے بل چلتا ہوا تلسی کے پاس آیا۔ بولا۔

"بندوبست کر لیا ہے؟ یا کرنے جا رہی ہو؟"

"کہاں سے کیا ہے!" تلسی کچھ گھبرا کر کچھ خفا ہو کر بولی "تین گھروں میں برتن جھاڑو کا کام کرتی ہوں۔ کسی نہ کسی کے دل میں دیا آجائے گی روپیٹ کے دس روپے تو مل ہی جائیں گے۔

مل جائیں گے نہیں۔ تم دس روپے لے کے آئی ہو۔" کھاکرے نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ تلسی کی نگاہیں نیچی ہو گئیں۔ اس کا ہاتھ بے اختیار اپنی چولی پر گیا۔ کھاکرے کا ہاتھ تلسی کے ہاتھ پر گیا۔ تلسی چیخی۔

"مجھے ہاتھ مت لگاؤ!"

کھاکرے کو ٹوٹ لگ رہی تھی۔ اس کے حلق میں کانٹے سے چبھ رہے تھے۔ دو کوزے پانی پی کر بھی اس کی پیاس نہیں بجھی تھی۔ اس کی لالچی آنکھوں میں شراب کی بوتل ڈولنے لگی۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنی خواہش کو چھپاتے ہوئے بڑی نرمی سے کہا۔

"مجھے دیدو۔ میں تانی کے لئے دوا لے کر آتا ہوں۔"

"میرے پاس نہیں ہیں!"

"تو جھوٹ بولتی ہے۔"

"گنگا مائی کی قسم۔"

"جھوٹ مت بول! پیسے اِدھر لا!"

"نہیں۔ میں نہیں دوں گی۔"

"کیسے نہیں دے گی؟"

تلسی نے اپنے دونوں ہاتھ چولی پر رکھ لئے تھے۔ کھاکرے نے بڑی سختی سے تلسی کے دونوں ہاتھ اس کی چولی سے جھٹک دیئے۔ تلسی نے پھر اپنے سینے سے لگا لئے۔ وہ زور زور سے ہانپ رہی تھی۔ کبھی کسی طرح وہ یہ دس روپے نہیں دے گی۔ تلسی اور کھاکرے میں لڑائی ہونے لگی۔ تانی آنکھیں کھول کر وحشیانہ نگاہوں سے دیکھنے لگی اور چیخنے لگی۔ اب کھاکرے بھی ایک وحشی جانور کی طرح تلسی پر جھپٹ پڑا۔ تلسی اپنے جسم و جان سے پورا زور لگا کر مدافعت کر رہی تھی۔ مگر کھاکرے نے اس کی چولی کو پھاڑ ڈالا اور ننگی چھاتیوں کے اندر نوٹ کو دبا ہوا دیکھ کر خوشی کی ایک چیخ کھاکرے کے منہ سے نکل گئی۔ خوشی کی یہ چیخ چھاتیوں کو ننگی دیکھ کر نہیں نکلی تھی ان کے اندر دبے ہوئے کاغذ کے پُرزے کو دیکھ کر نکلی تھی اس نے جھپٹا مار کر اس نوٹ کو وہاں سے اٹھا لیا

اور جھونپڑے سے باہر نکل گیا۔

جھونپڑوں کو پھلانگتا ہوا، دلدل کو پار کرتا سڑک پر دوڑتا ہوا کھاکرے غصہ میں بھرا ہوا سوچنے لگا۔ مجھے کیا سمجھتی ہے؟ میں اتنا نیچ، پتھر دل، جاہل اور ظالم ہوں کہ اپنی بیٹی کے دوا کے پیسوں کی شراب پی جاؤں گا؟ میں یہاں سے سیدھا ہری داس کیمسٹ کے اسٹور میں جاکر تانی کے لئے دوا لوں گا۔ جتنے کی بھی دوا آئے۔ دس کی آئے پانچ کی آئے دوا لے کر اور باقی پیسے مٹھی میں داب کر سیدھا واپس گھر پہنچوں گا۔ دوا اور باقی پیسے تلسی کے منہ پر مار دوں گا۔ یہ عورتیں سمجھتی ہی نہیں۔ مرد کیوں پیتے ہیں؟ ارے ہم کیا کوئی مزے کے لئے پیتے ہیں؟ دن بھر بلڈنگ میں اینٹ پتھر، گارا، چونا، سیمنٹ ڈھوتے ڈھوتے جب بدن کا پلستر اکھڑنے لگتا ہے تو دو گھونٹ پیتے ہیں۔ دن بھر کی مشقت سے ٹوٹ جانے والی ہڈیوں کو پھر سے جوڑنے کے لئے بند بند اور جوڑ جوڑ میں ابھرنے والی تھکن کو دُور کرنے کی خاطر، صرف زندہ رہنے کی خاطر، صرف دو روپے روز کی خاطر۔

چند لمحوں کے لئے کھاکرے ڈھونڈو کے قمار خانے کے قریب سے گزرتا ہوا رک گیا۔ اس نے نگاہ اٹھا کر قمار خانے کے بوسیدہ دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر اس نے آہستہ سے اپنی مٹھی کھولی۔ نوٹ کو دیکھا، مٹھی اور کھولی۔ اسے دونوں ہاتھوں میں لے کر نوٹ کی شکنوں کو صاف کیا۔ الٹ پلٹ کر غور سے دیکھا پھر مسکرا کر اپنی جیب میں ڈال کر آگے چلا.... نہیں.... کھاکرے نے اپنے آپ سے کہا۔ میں ڈھونڈو کے قمار خانے نہیں جاؤں گا۔ میں سیدھا ہری داس کیمسٹ کی دکان پر جاؤں گا اور ان دس روپوں سے اپنی بیٹی کے لئے دوا خریدوں گا۔ تلسی کتنی حیران رہ جائے گی۔ مجھے دوا لاتے دیکھ کر۔ تلسی مجھے سمجھتی نہیں ہے۔ آخر میں بھی انسان ہوں، ایک باپ ہوں۔ دل رکھتا ہوں۔ مجھے بھی اپنی بیٹی سے پیار ہے۔ مجبور ہو کے پیتا ہوں

کوئی خوشی سے نہیں پیتا ہوں۔ مگر آج میں تلسی کو دکھا دوں گا۔ سمجھتی کیا ہے مجھے؟ چھنال۔
کس کس طرح ناخنوں سے منہ نوچا ہے اس نے میرا۔ دوا لے کر جاؤں تو سالی سے سمجھ لوں۔ ایسی گڑا کے
کی ماروں گا کہ دس دن بستر سے نہ ہل سکے گی۔

تلسی کو پیٹنے کے لذیذ خیال سے متاثر ہو کر وہ کئی قدم ڈھونڈو کے قمار خانے سے آگے چلا
گیا۔ پھر یکایک ٹھٹک کر رُک گیا۔ آخر دو گھونٹ پی لینے میں کیا حرج ہے؟ دو بازی کھیل لینے
میں کتنے پیسے خرچ ہو جائیں گے؟ پانچ روپے کی دوا لوں گا پانچ روپے قمار خانے میں خرچ کر
دوں گا۔ اور تلسی کو کیا پتہ چلے گا کہ دس روپے کی دوا لایا یا پانچ کی؟ عورتیں تو بیوقوف ہوتی ہیں
اسے کیا پتہ چلے گا.... اور.... تانی؟۔

تانی بچ جائے گی۔ کیا ہے اسے؟ بس بخار ہی تو ہے پچھلے سال اسے ہیضہ ہوا تھا تو وہ
بچ گئی تھی۔ اس سے پچھلے سال اسے نمونیا ہوا تھا تو وہ بچ گئی تھی۔ اس سے دو برس پہلے اسے
چیچک نکل آئی تھی تو وہ بچ گئی تھی۔ گرمیوں کے بچے اتنی آسانی سے نہیں مرا کرتے۔ اور ادھر
تانی ضرور بچ جائے گی.... مگر نہیں.... مجھے فوراً دوا لے کر واپس جانا چاہیئے۔ وہ جلدی جلدی
چلنے لگا۔ پھر رک گیا۔ پھر آہستہ آہستہ سر جھکا کر دھیرے دھیرے چلنے لگا۔ اچھا پانچ نہیں خرچ
کروں گا صرف دو روپے کی شراب پی لوں گا۔ اور ایک روپے کا جوا کھیلوں گا۔ پانچ بھی نہیں
صرف تین روپے خرچ کروں گا۔ بہت ہو گیا تو اوپر سے تھیلا مار کہ ایک بیڑی بنڈل۔ یکایک
اس کی سوکھی زبان پر شراب کا تلخ ذائقہ اُبھرنے لگا۔ اس کے نتھنوں میں بیڑی کا دھواں چکر
کھانے لگا۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیاں تاش کو چھونے کے لئے بیتاب ہونے لگیں۔ اب وہ یوں
چل رہا تھا جیسے وہ اپنے تھکے ہوئے پیروں میں لوہے کی وزنی بیڑیاں گھسیٹتے ہوئے چل رہا ہو۔
یکایک وہ چلتے ہوئے رک گیا۔ بالکل بے بس ہو کر ڈھونڈو کے قمار خانے کے دروازے کی

جانب دیکھنے لگا۔

کندر اور جا اس کے دو ساتھی اور دوست آپس میں ہنستے بولتے، چالتے قمار خانے میں داخل ہو رہے تھے۔ دروازہ کھول کر وہ دونوں داخل ہو گئے تھے۔ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ قمار خانے کے اندر کی فضا اب کھاکرے کی آنکھوں کے آگے تصویریں کھینچنے لگی۔ وہ دونوں ایک میز پر بیٹھ کر شراب کی بوتل کا آرڈر کر رہے تھے۔ بوتل اس کے سامنے آ گئی تھی اور پھر تاش کے پتے فضا میں ایک رنگین دھنک کی طرح بکھرنے لگے کھاکرے کے لیئے اس کے آگے سوچنا ناقابل برداشت ہو گیا۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا قمار خانے کی طرف بڑھنے لگا۔ مگر اندر جانے سے قبل ہی گویا وہ قمار خانے میں داخل ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں قمار خانے کی مانوس فضا تھی۔ دوستوں کے قہقہے اور تیل میں بھنی ہوئی مچھلی کی اشتہا انگیز بو اور تاش کے پھسلتے ہوئے چکتے ہوئے نرم گرم پتے یہ دنیا باہر کی دنیا سے کتنی مختلف تھی۔ جہاں ہر لحظہ جان لیوا محنت کرنی پڑتی ہے۔ پھر کتنی ہی محنت کرو ملتے دو روپے ہی ہیں۔ صرف دو روپے روز۔

رات کے بڑھتے ہوئے اندھیروں میں تلسی نے اسے قمار خانے میں جا کر پکڑا۔ جب وہ کھاکرے کی کرسی کے پیچھے جا کھڑی ہوئی تو یکایک قمار خانے میں سناٹا چھا گیا۔ وہ اس قدر چپ تھی، اس قدر ٹھنڈی اور مطمئن تھی اور اس قدر پتھر صورت بے کر آئی تھی کہ اسے دیکھتے ہی چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔ کھاکرے کے دوستوں نے پتے پھینکنا بند کر دیا۔

"چلو!" کھاکرے نے شراب کے نشے میں پھنکار کر کندر و سے کہا۔ مگر کندر و نے پتہ نہیں چلا۔ وہ کھاکرے کے عین پیچھے دیکھ رہا تھا۔ کھاکرے کرسی پر بیٹھے بیٹھے پیچھے مڑا تو اسے تلسی نظر آئی۔

"کیوں آئی ہے؟ گھر جاؤ!" کھاکرے نے غصے میں دونوں ہاتھ جھلاتے ہوئے کہا۔ ہاتھ جھلاتے ہی نشے میں اس کا توازن بگڑ گیا۔ اور وہ کرسی کے نیچے گر پڑا۔ کسی نے اسے اٹھانے کی

کوشش نہیں کی۔ تلسی نے وہیں کھڑے کھڑے گرے ہوئے کھاکرے سے مخاطب ہو کے کہا۔

"گھر چلو! تائی مر گئی ہے۔"

کھاکرے کا گرا ہوا سر فرش سے اوپر اٹھا۔ وہ پھٹی پھٹی وحشت زدہ آنکھوں سے گھور کر تلسی کی طرف دیکھنے لگا۔ "کیا کہتی ہے تو؟"

یہی کہہ رہی ہوں۔ تائی مر گئی ہے۔ اٹھو گھر چلو۔

کھاکرے نے اٹھنے کی کوشش کی۔ اس کے دونوں ہاتھوں نے کرسی کے ایک پائے کو جکڑ لیا تھا۔ وہ کرسی کے پائے کے سہارے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یکایک اس نے کرسی کے پائے کو دونوں ہاتھوں سے جکڑ کر اپنے سینے سے لگا لیا اور روتے ہوئے کہنے لگا۔

"نہیں تو جھوٹ بولتی ہے۔ تائی مر نہیں سکتی۔ میری تائی مر نہیں سکتی۔"

جما اور رکندر وا اپنی کرسیوں سے اٹھ کر اسے اٹھانے لگے۔ اب وہ فرش پر کھڑا لڑکھڑا رہا تھا۔ تلسی نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا اور اس کے جسم کو گھما کر اسے قمار خانے سے باہر دروازے کی طرف لے جانے لگی۔ قمار خانے کا مالک ڈھونڈو آگے بڑھا اور بولا

"ساڑھے بارہ روپے دیئے جاؤ!"

پھر اس نے جواب کا انتظار کئے بغیر کھاکرے کی جیب ٹٹولی اور دس روپے کا نوٹ نکال لیا اور اسے اچھی طرح پہچان کر بولا۔

"یہ دس روپے ہیں باقی ڈھائی روپے تم پر قرض رہا۔"

تلسی کوئی جواب دیئے بغیر روتے ہوئے کھاکرے کو قمار خانے سے باہر لے گئی۔ ڈھونڈو دیر تک دروازے میں کھڑا رہا نوٹ کو اپنے ہاتھ میں لئے۔ کھاکرے ایک بچے کی طرح سر جھکائے سسکیاں بھرتا ہوا تلسی کے ساتھ اپنے گھر کو جا رہا تھا۔

جب ڈھونڈ اس قمار خانے میں آیا تو سب اس کی طرف خاموش نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ یکایک ڈھونڈو غصّے سے بھر کر بولا۔

"تو کیا کروں؟ کس کس پر ترس کھاؤں؟ یہاں سب غریب ہیں" وہ غصّے سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ پھر بھی جب کوئی نہیں بولا تو وہ آپ ہی آپ بول پڑا...... "میری مصیبت کوئی نہیں جانتا۔ کیسے کیسے جتن کر کے یہ بھڑ الاتا ہوں۔ میں ترس نہیں کھا سکتا!"

اتنا کہہ کر ڈھونڈو نے دراز کھول کر نوٹ کو گلے بیچ ڈال دیا۔ اتنے میں ایک لڑکا ہاتھ میں تھیلے کر آیا اور کاؤنٹر پر جھک کر بڑی رازداری سے ڈھونڈے سے مخاطب ہوا۔ سیٹھ گوگل داس نے اسکاچ وہسکی کی ایک بوتل مانگی ہے۔

"ایک سو اسی روپے ہوں گے۔" ڈھونڈو نے اس کے کان میں کہا۔

لڑکے نے سو سو کے دو نوٹ ڈھونڈو کے سامنے رکھے۔ ڈھونڈو نے جلدی سے ان پر ہاتھ رکھ دیا۔ لڑکے کو اشارہ کر کے کاؤنٹر کے پیچھے اندر کے کمرے میں لے گیا۔ بلیک ڈاگ کی ایک بوتل نکال کر لڑکے کو دی۔ لڑکے نے تھیلے میں چھپالی۔ واپس آکر ڈھونڈو نے کاؤنٹر کی دراز کھول کر اسی نوٹ کو نکالا۔ ایک اور نوٹ دس کا نکالا۔ بیس کے دو نوٹ لے کر لڑکا تھیلا اٹھا کر باہر چلا گیا۔

دوسرے دن سیٹھ گوگل داس کوئی گیارہ بجے کے قریب بستر سے اٹھا۔ رات (Hang over) دور کرنے کے لئے اس نے ہاتھ نیچے کر کے پلنگ کے نیچے رکھی ہوئی بلیک ڈاگ کی بچی کھچی وہسکی ایک گلاس میں انڈیلی۔ سگریٹ کے پیکٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ پیکٹ خالی۔ اس نے پلنگ سے لگے ہوئے بجلی کے بٹن کو دبایا۔ کل رات والا نوکر ایک اخبار لے کر اندر آیا۔ سیٹھ نے اپنا بٹوہ کھولا جہاں تائی کی دوا والا نوٹ دوسرے نوٹوں کے ساتھ پڑا ہوا سوتا تھا۔ سیٹھ نے

اسے ہاتھ لگایا۔ پانچ کے نوٹ کو ہاتھ لگایا۔ پھر دو روپے کا ایک نوٹ نکال کر نوکر کو دیتے ہوئے بولا: ایک پیکیٹ سلور فلیک کا لاؤ۔

لڑکا دو روپے کا نوٹ لے کر چلا گیا۔ بٹوہ سیٹھ کی گود میں کھلا پڑا تھا۔ سیٹھ نے وہسکی کا ایک گھونٹ پیتے ہوئے اخبار کھولا۔ پہلے صفحے پر ہی سیٹھ گوگل داس کی تصویر تھی۔ کیونکہ اس نے کل رات ہی ایک لاکھ روپے کا چندہ ایک ہسپتال کی تعمیر کے لئے دیا تھا۔ تائی کے مرنے کی کوئی خبر نہ تھی۔

پپیا

نواب بڑا اتریلا اور زنخاں سا لونڈا تھا۔ زرینہ کو اس لئے پسند تھا کہ وہ زرینہ کے ہاتھوں سے پٹ کر اور رو دھو کر صبر کر لیتا تھا۔ دوسرے نوکروں کی طرح بوریہ بستر باندھ کر رخصت نہیں ہو جاتا تھا۔

اس کے گندمی رنگ چہرے پر چیچک کے داغ تھے اور وہ بہت دُبلا تھا اور بہت کھاتا تھا اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جو وہ کھاتا ہے وہ کہاں جاتا ہے۔ اس کی آواز میں ایک ہلکی سی تتلاہٹ تھی۔ جب وہ کھڑا ہوتا تھا تو کبھی سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ کسی دیوار یا کسی دروازہ سے لگ کر نیم دراز حالت میں یوں کھڑا ہوتا تھا کہ پاؤں فرش پر گھسٹ رہے ہیں سر بائیں طرف کو لٹکا ہوا ہے تو کولہا دائیں طرف کو نکلا ہوا ہے ایک ہاتھ ماتھے پر

ہے تو دوسرے سے بیٹھ کھجارہے ہیں۔ نواب کو عورتوں کی طرح ہاتھ ہلا ہلا کر باتیں کرنے کا شوق تھا۔ انہی کی طرح وہ فقروں کو چبا کے چپٹا کر کے یا ربڑ کی طرح کھینچ کھینچ کے بولتا تھا مگر باہر کے کام میں بہت ہوشیار تھا۔ اس لئے اپنی تمام مضحکہ خیز اداؤں اور غمزوں کے باوجود قابلِ برداشت تھا۔ گھر کا باورچی تین دن سے غائب تھا اور نواب کو کچن میں کام کرنا پڑ رہا تھا۔ حالاں کہ اسے صرف اوپر کے کام کے لئے رکھا گیا تھا۔ زرینہ لڑکیوں کے کالج میں پڑھانے جاتی تھی، میں اپنے دفتر جاتا تھا اس لئے اگر نواب کھانا نہ پکائے تو کون پکائے اور اس سے مشکل مسئلہ یہ تھا کہ باورچی کون ڈھونڈے اور کب! یہاں کسی کو فرصت ہی میسر نہ تھی۔

نواب کو جب تین دن کچن میں بگین گھارنا پڑے اور لہسن کی چٹنی پیس کر کھڑے مصالحے کا قورمہ تیار کرنا پڑا تو اس کی ساری تتلاہٹ اور نسائیت ختم ہوگئی۔ مردوں کی طرح بڑے کرخت اور جھنجھلائے ہوئے لہجہ میں بول پڑا۔ صاحب ہم سے نہیں ہوتا ہم کو ایک دن کی چھٹی دو ہم آپ کے لئے ایک باورچی ڈھونڈ کے لائے گا۔

"کوئی باورچی ہے تمہاری نظر میں؟ زرینہ نے اس کی جھنجھلاہٹ پر مسکرا کے پوچھا۔

کچن سے باہر آکر نواب کو جو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے لگے تو اس کے مزاج کی نسائیت پھر ابھرنے لگی۔ اس پر اُسے گھر کی مالکن کی مسکراہٹ جو ملی تو اور بھی پھیل گئے۔ آپ نے ایک کندھا اوپر اُچکایا دُوسرا نیچے کیا، بائیں کولہے کو اندر کی طرف جُھکایا دائیں والے کو ذرا سا باہر نکالا اور اپنے دونوں ہاتھ بڑی ادا سے ملتے ہوئے بولے۔

"اب لائیں گے کہیں نہ کہیں سے آپ کے لئے باورچی۔" نواب نے اپنے دیدے گھماتے ہوئے باورچی کے مسئلہ کو ایک پُراسرار سیاسی راز کی طرح ہمارے سامنے کچھ اس طرح پیش کیا کہ جی جل کے کباب ہوگیا۔ جی چاہا سالے کو دوں دو جھانپڑ اور اس کی ساری اترا ہٹ

نکال دوں۔ مگر ضرورت باورچی کی تھی اور باورچی ڈھونڈنے کی فرصت مجھے تھی نہ زرینہ کو۔ اس لئے نواب کو ایک دن کی چھٹی دینا پڑی۔

ایک دن کے بعد اتوار تھا میں اپنے کمرہ میں بیزار بیٹھا ہوا ملگجی صبح کی نیلی نیلی روشنی میں اپنا سر خود ہی ہولے ہولے دبا رہا تھا۔ کبھی کبھی مجھے اپنا سر ٹوتھ پیسٹ کی ٹیوب کی طرح معلوم ہوتا تھا جب تک دباؤ نہیں کچھ نکلتا نہیں!

اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ نواب دونوں ہاتھوں سے دروازہ کی پٹی کو تھامے گردن ایک طرف کو لٹکائے نیم باز آنکھوں سے مجھے دیکھ رہے ہیں۔

"ہیں۔ ہیں!..... وہ ہنسکر بولے۔" ہم باورچی لے آئے۔"

"کدھر ہے؟ میں نے ڈپٹ کر پوچھا۔

نواب خائف ہو کر ذرا سے سیدھے ہوئے۔ اپنے دونوں بازو دروازہ کی پٹی سے اتار کر اپنی کمر پر رکھ لئے پھر ذرا پیچھے ہٹ کر کسی اور کو راستہ دے کر بولے۔

"اندر چلے آؤ۔"

کالا، دبلا پتلا کرنجی آنکھوں والا ایک آدمی اندر آیا عمر کوئی پینتیس برس کی ہوگی — چھوٹے چھوٹے کالے کالے ہونٹ، چھوٹی چھوٹی کرنجی آنکھیں، تنگ ماتھا بال اُلجھے ہوئے گال اندر دھنسے ہوئے دانتوں کی ریخوں میں پان کا بھورا میل نمایاں۔ شیو کے باوجود ٹھوڑی پر کہیں کہیں بال رہ گئے تھے۔ عجب کراہیت سی محسوس ہوئی۔

"تم باورچی ہو؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"جی۔"

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"ادم پرکاش۔"

میں نے اُسے سر سے پیر تک دیکھا پھر نواب سے کہا۔ "اسے بیگم صاحب کے پاس لے جاؤ وہ دیکھ لیں اور چاہیں تو رکھ لیں۔"

دوپہر کے کھانے میں شاہجہانی قورمہ تھا۔ اور شملہ مرچ میں بھرا ہوا قیمہ تھا اور دم کئے آلو تھے۔ مٹر پلاؤ اور رائتہ اور دو طرح کا میٹھا۔ شاہی ٹکڑے اور دودھی حلوا ہر چیز عمدہ اور نفیس تھی صحیح ذائقہ والی۔

میں نے خوش ہو کر کہا۔ "ادم پرکاش کھانا تو تم ٹھیک پکا لیتے ہو۔"

"ادم پرکاش۔" زرینہ میری طرف حیرت سے دیکھ کر بولیں۔ "مگر اس کا نام تو اشتیاق ہے؟"

میں نے باورچی کی طرف دیکھا جو ایک کونے میں اپنے دونوں ہاتھ اپنی ناف پر رکھے کھڑا تھا اور مجھے دیکھنے کی بجائے زمین کو دیکھ رہا تھا۔

"کیوں بے۔ تم نے مجھے اپنا نام غلط کیوں بتایا؟" میں نے باورچی سے پوچھا۔

بولا۔ "صاحب جب میں آپ کے کمرہ میں آیا اور آپ کو دیکھا تو ایسا لگا کہ شاید آپ ہندو ہیں تو میں نے آپ کو اپنا نام ادم پرکاش بتایا۔ پھر میں بیگم صاحب کے کمرہ میں گیا تو مجھ کو ایسا لگا جیسے وہ مسلمان ہیں تو میں نے اُن کو اپنا نام اشتیاق بتا دیا۔"

"مگر بے وقوف۔ تم ایک کمرہ میں ادم پرکاش اور دوسرے کمرے میں اشتیاق کیسے ہو سکتے ہو!"

"دلّی میں ایسا کرنا پڑتا ہے صاحب۔ ایک گھر میں اوم پرکاش تو دوسرے گھر میں اشتیاق بتانا پڑتا ہے ...... پیٹ روٹی مانگتا ہے صاحب!" اس نے کسی قدر شکایت کے لہجے میں کہا اور اس کے لہجہ سے یہ بھی معلوم ہوتا تھا جیسے اس کو شکایت اس امر کی نہیں ہے

کہ اسے اپنا نام غلط کیوں بتانا پڑا بلکہ اس بات کی ہے کہ پیٹ روٹی کیوں مانگتا ہے؟

گرمیوں کے دن تھے۔ دوپہر میں جب حبس بڑھنے لگا تو میں گھبرا کر دوبارہ نہانے کیلئے باتھ روم میں گھسا۔ ٹونٹی گھما کر معلوم کیا کہ شاور خراب ہو چکا ہے۔ نواب کو آواز دی تو معلوم ہوا کہ وہ اپنے تلووں میں تیل چڑھا رہا ہے۔ اشتیاق بھاگا بھاگا آیا۔ میں نے اُس سے کہا۔

"چوک میں جا کر منشی سنگھ پلمبر کو بلا لاؤ شاور خراب ہے۔"

"میں ٹھیک کئے دیتا ہوں۔" اشتیاق بولا۔

"تم؟"

وہ سر جھکا کر بڑی عاجزی سے بولا "جی میں پلمبنگ کا کام بھی جانتا ہوں۔

پانچ منٹ میں اُس نے شاور ٹھیک کر دیا۔

شام کو بجلی کا پیڈسٹل پنکھا جو صحن میں چلتا تھا خراب ہو گیا۔ زرینہ نے نواب کو آواز دی تو معلوم ہوا کہ وہ ابھی دوپہر کی نیند سے فارغ نہیں ہوا ہے۔ لہٰذا اشتیاق کو بلایا گیا کہ وہ چوک میں پنکھے والے کے پاس چلا جائے اور اپنے سامنے پنکھا درست کرا کے لائے۔ بہت گرمی ہے آج تو، رات بھر صحن میں پنکھا چلے گا۔ اشتیاق نے گہرے تجسس سے پنکھے کا معائنہ کیا۔ معائنہ کرنے کے بعد اس نے اپنے دونوں بازو اپنی ناف پر رکھ لئے۔ بولا "حضور میں یہ پنکھا ٹھیک کر سکتا ہوں۔

"کیا تم پنکھے کا کام بھی جانتے ہو؟" میں نے اُس سے پُوچھا!

سر جھکا کر بولا۔ "جی! بجلی کا کام بھی جانتا ہوں پنکھا فٹ کر لیتا ہوں ابھی کر کے دکھاتا ہُوں ــــ"

ڈیڑھ گھنٹے میں پیڈسٹل فین فر فر چلنے لگا۔ میں نے اشتیاق کو نئی نظروں سے دیکھا وہ

کچھ شرمایا کچھ مسکرایا آخر میں کچھ سُکڑ کر کچھ سمٹ کر کچھ دُبک کر کچن میں چلا گیا۔

رات کے کھانے میں رامپوری چکن تھا۔ چکن کاٹو تو اندر بریانی ملتی ہے۔ بریانی ہٹاؤ تو اندر چکن چاٹ نظر آتی ہے چکن چاٹ کھاؤ تو اندر انڈوں کا خاگینہ ملتا ہے بادام اور کشمش کے ساتھ۔ عجیب بھول بھلیاں قسم کی ڈش تھی مگر ستھری اور مزیدار۔ میں نے ایک روپیہ انعام دیا تو جھک کر سات بار کورنش بجالائے۔ بولے۔

"آپ نے دیا ہے انعام۔ یہ ہے بندے پر اکرام۔"

"ارے" میرے منہ سے نکلا۔

"جی ہاں۔" سر جھکا کر بولے۔ "میں شاعر بھی ہوں میرا تخلص تنہائی ہے۔"

میری طبیعت شاعروں سے بہت اُلجھتی ہے۔ سُنا ہے ہر وقت پان کھاتے رہتے ہیں اور شعر اُگلتے رہتے ہیں۔ پہلے جی چاہا آج ہی جواب دے دوں۔ پھر اگلے بیس روز میں معلوم ہوا کہ حضرت بیس بائیس قسم کے دوسرے پیشے بھی جانتے ہیں۔ کُرسیاں بُن لیتے ہیں مونڈھے ٹھیک کر لیتے ہیں لکڑی کا ٹوٹا پھوٹا سامان ٹھیک کر لیتے ہیں۔ کیونکہ بڑھئی کا کام بھی سیکھا ہے۔ سینما کے گیٹ کیپر بھی رہ چکے ہیں، گنڈیریاں بیچی ہیں پنواڑی کے ہاں کام کیا ہے ٹھیلہ کھینچا ہے۔ کھلونوں کی فیکٹری میں کام کیا ہے، حجام بھی رہ چکے ہیں۔ سلائی سے لے کر کپڑوں کی دھلائی تک کے سب مراحل کو پیشہ ورحیثیت سے پرکھ چکے ہیں۔ بڑے عمدہ مالشیئے ہیں۔ سرکی چمپی کے اُستاد ہیں، کن میلیے بھی ہیں۔ چاٹ بنانا جانتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ انتہائی کم خوراک ہے۔ زرینہ کو ان کی یہ عادت بہت بھاگئی۔ کیونکہ وہ نواب کی اشتہا سے عاجز رہتی تھی۔ اس لئے اُس نے دھیرے دھیرے گھر کا سارا کام اشتیاق کو سونپ دیا۔

دو ماہ میں اشتیاق کا سکہ سارے گھر پر جم گیا۔ اس طرح بھاگ بھاگ کے کام کرتا تھا کہ نواب اور بھی کاہل اور ناکارہ ہوتا گیا اور میں نے دیکھا کہ اشتیاق بھی یہی کچھ چاہتا ہے۔ عمر میں نواب اشتیاق سے سترہ اٹھارہ برس چھوٹا ہوگا۔ مگر تھوڑے ہی عرصہ میں نواب اشتیاق سے ایسا سلوک کرنے لگا جیسے وہ مالک ہو اور اشتیاق اس کا غلام ہو۔ پہلے تو میں نے سمجھا کہ یہ سب جذبۂ احسان مندی میں ہو رہا ہے بعد میں خیال آیا ممکن ہے اشتیاق نواب پر عاشق ہو گیا ہو حالانکہ نواب پر عاشق ہونا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ عاشق کی آنکھوں کی بینائی بے حد کمزور ہو۔ حسِ سماعت تقریباً نہ ہو اور کوئی لطیف جذبہ دل میں نہ ہو۔ بعد میں معلوم ہوا کہ میرا یہ خیال بھی صحیح نہ تھا۔ اشتیاق نہ نواب کو اپنا محسن سمجھتا تھا نہ اس پر فریفتہ تھا۔ بس اُسے دوسروں کو کھلانے کا مرض تھا اور دوسروں کو کھلا پلا کے دل میں ایک عجیب سی خوشی محسوس کرتا تھا چونکہ وہ خود کم کھاتا تھا اس لئے وہ اپنے حصہ کی خوراک بھی نواب کو منتقل کر دیتا۔ ہمارے بعد اس کے لئے سالن کا بہترین حصہ مخصوص کر دیتا۔ پہلے اسے کھلاتا پھر خود کھاتا۔ ہولے ہولے نواب نے کام میں دلچسپی لینا بالکل ختم کر دیا۔ کسی بڑی بی کی طرح ایک کھٹیا پر پڑا کراہتا رہتا اور میں نے دیکھا کہ اشتیاق اُس کی فرضی بیماری کو بڑھا چڑھا کے بیان کرنے میں بڑا مزہ لیتا اور اُسے کھٹیا پر مستقل آرام کرنے کا مشورہ دیتا۔ اس کے لئے بازار سے دوا لاتا اور پھل سگریٹ بیڑی کے پیسے بھی خود دیتا۔ کبھی کبھی ایک آدھ بُش شرٹ اور پاجامہ یا پتلون بھی سلا دیتا۔ ہولے ہولے اشتیاق کی تنخواہ کا بیشتر حصہ نواب پر خرچ ہونے لگا اور نواب اپنی تنخواہ کی کُل رقم بچا کے اپنی ماں کو علی گڑھ بھیجنے لگا۔

زرینہ نے کئی بار اشتیاق کو سمجھایا۔ اسے اپنی تنخواہ جمع کرنے کے فائدے سمجھائے

مگر اشتیاق پر اُس کے سمجھانے بجھانے کا کوئی اثر نہ ہوا مُسکرا کر بولا۔
"بیگم صاحب۔ بچہ ہے کھا لیتا ہے تو کیا کرتا ہے۔"
"ارے تو اپنے لئے بھی تو کچھ کرے کمبخت۔" زرینہ چڑ کر اس سے کہتی۔" دوسروں کے لئے کیوں مرتا ہے۔"
"میرا آگے پیچھے کون ہے۔ بیگم صاحب۔" اشتیاق گردن جھکا کر جواب دیتا۔" بھائی نہیں بہن نہیں، ماں نہیں باپ نہیں۔ سب بھرت پور کے فسادوں میں مارے گئے۔ میرا سینہ ہر وقت خالی خالی سا رہتا ہے۔"
کچھ دنوں کے بعد نواب کی ماں کا خط علی گڑھ سے آیا اُس نے نواب کے لئے ایک لڑکی ٹھیک کر لی تھی، دو ماہ بعد شادی تھی۔ ماں اُسے واپس بلا رہی تھی۔ غفورا سائیکل والا جس کے ہاں دہلی آنے سے پہلے نواب کام کرتا تھا وہ اب پھر اُسے کام دینے کے لئے تیار تھا اس لئے نواب واپس ـــــ جانے کے لئے تیار ہو گیا ہم بھی اندر سے بہت خوش تھے کیونکہ نواب اب تو تقریباً مفت کی کھاتا تھا۔ ورنہ سارا کام تو اشتیاق نے سنبھال لیا تھا۔ زرینہ نے بھی طے کر لیا تھا کہ نواب کے جانے کے بعد دوپہر کے کام کے لئے کسی کو نہ رکھے گی۔ اشتیاق کی موجودگی میں کسی دوسرے نوکر کی ضرورت نہ تھی۔
زرینہ بولی۔" دیکھ نواب کی شادی ہو رہی ہے اب تو بھی شادی کرلے اشتیاق۔ میں تیری بیوی کو رکھ لوں گی مجھے ایک ملازمہ کی ضرورت ہے۔"
شادی کے نام پر میں نے دیکھا کہ اشتیاق کچھ چڑ سا گیا ہے۔ اُس کی بھنویں تن گئیں تنگ ماتھے پر بالوں کی لٹیں ڈولنے لگیں اور اس کے چھوٹے سے ہونٹ پھڑکنے لگے مگر وہ کچھ بولا نہیں۔ سر جھکا کر کھانے کے کمرہ سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد نواب

کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ آئی۔ کھانے کی میز کے قریب آ کر بڑی رازداری سے بولا۔

"ارے صاحب۔ یہ کیا شادی کرے گا اس کی بیوی تو شادی کے دوسرے دن ہی اسے چھوڑ کر بھاگ گئی تھی۔"

"کیوں؟" زرینہ نے پوچھا۔

"معلوم نہیں بیگم صاحب"۔ نواب بولا۔ "یہ کچھ بتاتا تو ہے نہیں۔"

چند منٹ کے بعد جب ہم لوگ کھانا کھا کے صحن میں ہاتھ دھونے کے لئے تو دیکھا کہ اشتیاق کچن میں میلے برتن اور راکھ کا ڈھیر اپنے سامنے رکھے خلا میں گھور رہا ہے اور اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں کسی نامعلوم جذبہ سے بھیگ کر تارا سی چمک رہی ہیں۔

مجھے پہلی بار اشتیاق میں دلچسپی پیدا ہوئی۔

آٹھ دس روز کے بعد نواب نے علی گڑھ واپس جانے کا پروگرام بنا لیا۔ اس کے جانے پر اشتیاق چپکے چپکے بہت رویا اس کی آنکھیں سُرخ تھیں اور ہونٹوں کے کونے بے طرح پھڑکتے تھے مگر ——— زبان سے کچھ نہیں کہا۔ اُس نے نواب کے لئے سفری ناشتہ تیار کیا حالانکہ صرف ڈھائی گھنٹے کا سفر تھا مگر قیمے کے پراٹھے اور سرخ مرچوں کا اچار اور آلو کا بھُرتہ اور بیسنی روٹی اور مکھن کی ایک گولی۔ وہ نواب کی بھُوک سے واقف تھا۔ خود اپنے خرچ سے اُس نے نواب کا ناشتہ تیار کیا تھا اس لئے ہم شکایت بھی نہ کر سکتے تھے۔ وہ خود نواب کے لئے سکوٹر لے کر آیا اس کا سامان سکوٹر میں رکھا اور اُسے پرانی دلی کے سٹیشن پر گاڑی میں سوار کرا کے واپس آیا۔

دو دن تک اس طرح مضطرب اور بے چین پھرتا رہا جیسے اُس کا گھر لُٹ گیا ہو اور وہ کسی اجاڑ ویرانے میں گھوم رہا ہو۔ کھانے کا معیار ایک دم گر گیا تھا۔ قورمہ اس کے جذبہ

کی طرح تلخ تھا اور قلیہ اتنا پتلا جیسے کسی نے اس کی ساری اُمیدوں پر پانی پھیر دیا ہو۔ چپاتیاں بے ڈول اور بے ڈھنگی اور ان پر جگہ جگہ مایوسی کی راکھ لگی ہوئی۔ دو دن تک تو ہم نے کسی نہ کسی طرح صبر کر کے کھانا زہر مار کیا اور یہ سوچ لیا کہ اگر معاملہ یونہی چلتا رہا تو اشتیاق کو جواب دینا پڑے گا۔

مگر دو دن کے بعد اشتیاق سنبھل گیا۔ کہیں سے وہ ایک بلی کا بچہ اٹھا لایا اور اب وہ بلی کا بچہ اشتیاق کی توجہ کا مرکز بن گیا گھر کا کام کرنے کے بعد وہ اپنا سارا وقت جو اس سے پہلے نواب کو دیتا تھا اب بلی کے بچہ پر صرف کرنے لگا۔ اور اپنی تنخواہ کا کافی حصّہ بلی کے لئے دودھ اور گوشت پر خرچ کرنے لگا اور یوں دیکھا جائے تو بلی کا بچہ نواب سے کچھ کم نہیں کھاتا تھا۔ اس کے عشوے اور نخرے بھی نواب سے کم نہ تھے وہ اتنا ہی اتریلا تھا اور ویسی ہی ادائیں دکھاتا تھا۔ دو ہی دن میں اشتیاق سنبھل گیا اور کھانے کا معیار بھی ٹھیک ہوتے ہوتے پھر اپنی پہلی اور اصلی حالت پر آ گیا اور ہم لوگوں نے چین کا سانس لیا۔

اشتیاق کسی کام کو ناں نہ کرتا تھا کیونکہ وہ اپنی دانست میں سب کچھ جانتا تھا۔ وہ کسی شیخی خورے کی عادت نہ تھی، اس قدر جس قدر یہ احساس کہ مجھے یہ کام بھی کر کے دکھا دینا چاہیئے۔ اُسے اپنے ذاتی وقار کے تحفظ کا بہت خیال تھا اور ایک عجیب سی لگن تھی اُس کے دل میں جو اُسے ہر کام کو پورا کرنے کے لئے اُکساتی تھی۔ چاہے وہ اُسے جانتا ہو یا نہ جانتا ہو۔ کئی دنوں سے ریڈیو خراب تھا اور میں چونکہ ریڈیو کا کام اچھی طرح جانتا ہوں اس لئے زرینہ نے مجھے کئی بار ریڈیو ٹھیک کرنے کے لئے کہا۔ مگر دفتر کی طویل جھک جھک کے بعد ذہن اور جسم دونوں اس قدر تھک جاتے ہیں کہ کھولنے اور ٹھیک کرنے کی ہمت کہاں سے لائیں؟ میں اس کام کو آج اور کل پر ٹال رہا تھا۔

ایک دن دفتر سے جو آیا تو دیکھا کہ ڈرائنگ روم کے ایک کونے میں پورا ریڈیو کھُلا پڑا ہے اور اشتیاق عجب گھبرائی ہوئی حالت میں اُسے ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور زرینہ قریب کھڑی رونکھی ہو رہی ہے۔ میں نے آنکھوں کے اشارے ہی اشارے میں پوچھا کیا بات ہے؟

زرینہ بولی "اشتیاق نے کہا تھا میں ریڈیو بھی ٹھیک کر لیتا ہوں اور تمہیں کئی دن سے فرصت نہیں مل رہی ہے اس لئے میں نے اشتیاق کو اس کام پر لگا دیا وہ ڈھائی گھنٹے سے ریڈیو پر کام کر رہے ہیں حالانکہ تم نے بتایا تھا کہ معمولی سا نقص ہے!

میں معاملہ کی نزاکت کو سمجھ گیا۔ اشتیاق اپنے چھوٹے سے ماتھے پر بال گرائے مجھ سے آنکھیں چرائے ریڈیو پر کام کر رہے تھے۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ ریڈیو کھول تو لیا ہے مگر اب جوڑنا نہیں آتا۔ چہرہ سے پسینہ پھوٹ پڑا تھا۔ میں نے زرینہ کو باہر بھیج دیا اور خود اشتیاق کے ساتھ کام کرنے میں مصروف ہو گیا۔ مگر میں نے اشتیاق کو بھی محسوس ہونے دیا کہ مجھے معلوم ہے کہ اُسے یہ کام نہیں آتا۔ بلکہ میں نے اس طریقہ پر کام کو آگے بڑھایا جیسے ہر کام اشتیاق کی مرضی سے ہو رہا ہے۔

گھنٹہ بھر میں ریڈیو ٹھیک ہو گیا زرینہ بہت خوش ہوئی اس نے اشتیاق کو دو روپے انعام میں دیئے۔ مگر چند دنوں کے بعد پھر اشتیاق کی شامت آئی۔ زرینہ نے کہیں اُس سے پوچھ لیا۔ کیا تم دس گُلّے بنا سکتے ہو؟

"جی ہاں" اشتیاق فوراً بولے۔

"ایک دن بنا کے دکھاؤ۔"

"آج ہی رات کو بناؤں گا۔"

رات کے کھانے کے بعد دیر تک اشتیاق کچن میں کچھ کھٹر پٹر کرتا رہا۔ انگیٹھی سے دیر تک دھواں سلگتا رہا۔ منہ میں بیڑی جلتی رہی ماتھے پر بال الجھتے رہے اور کچن کی زرد روشنی دیر تک صحن میں اپنا سر پٹکتی رہی۔ کوئی ایک بجے کے قریب کچن کی بتی بجھی اور اشتیاق نے دوسرے دن صبح ناشتہ میں برف میں ٹھنڈے کئے گئے رس گلے تازے اور عمدہ اور گلاب کی خوشبو سے مہکتے ہوئے پیش کئے۔

"یہ رس گلے تم نے بنائے ہیں؟" زرینہ نے حیرت سے پوچھا۔

"جی۔ اسی خاکسار نے!" اشتیاق دروازہ سے لگ کر نظریں جھکا کر پاؤں سے فرش کو کریدنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

"بالکل بازار کے سے معلوم ہوتے ہیں!" زرینہ تعریف کرتے ہوئے بولی۔

"یہی تو ان کی خوبی ہے"۔ میں نے کہا "سیدھے بازار سے لائے گئے ہیں۔"

"جی نہیں۔" اشتیاق نے زور سے احتجاج کیا۔

اس کے احتجاج کی شدت دیکھ کر زرینہ کا شبہ اور بڑھ گیا۔ بولی۔ "تو آج رات کو میرے سامنے رس گلے بناؤ۔ میں خود دیکھوں گی۔"

"جی بہت اچھا۔"

اشتیاق نے رس گلوں کے سلسلے میں چند چیزوں کی فہرست پیش کی جو منظور کر دی گئی۔ دوپہر میں بہت دیر تک اشتیاق بازار میں رہے۔ سرِ شام زرینہ نے اُن کے جھولے کی تلاشی لے لی کہ کہیں وہ رس گلے بازار سے نہ لے آئے ہوں۔ رات کے کھانے کے بعد اشتیاق نے بڑے اہتمام سے رس گلے کا کاروبار کچن میں پھیلا دیا۔ زرینہ نے گھر کو اندر سے بند کر کے تالا لگا دیا تھا اور ہر پندرہ بیس منٹ کے بعد کچن میں جھانک لیتی تھی۔ کوئی دو بجے کے

قریب جب نیند کا غلبہ شدید ہونے لگا تو رس گلے تیار ہو گئے۔ اشتیاق ایک قاب میں رس گلے لے کر آئے۔ کھانڈ کے مقطر شیرے میں فینائل کی گولیوں سے بھی دو تہائی کم کے حجم کی سفید گولیاں سی تیر رہی تھیں۔ زرینہ چیخی!

"ارے یہ رس گلے ہیں، بکری کی مینگنی کے برابر۔؟"

"ابھی چھوٹے ہیں! دیکھئے سمجھئے بیگم صاحب۔ یہ رس گلے ابھی چھوٹے ہیں مگر رات بھر شیرا پیئیں گے صبح کو پھول کر پورا رس گلہ ہو جائیں گے۔"

اشتیاق نے سمجھایا۔

زرینہ کو یقین آیا نہ مجھے۔ مگر نیند کا غلبہ شدید تھا اس لئے ہم سو گئے۔ صبح اُٹھے تو ناشتہ پر پورے حجم کے بڑی گولائی کے سفید رس گلے کھانے کو ملے۔ کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ رات کو کونین کی گولیوں کے برابر حجم والے رس گلے پھول کر اس قدر بڑے ہو گئے تھے۔ مگر رات بھر کون جاگے؟ اور چوکیداری کرے؟ اشتیاق ضرور صبح صبح بازار سے رس گلے خرید لائے ہوں گے اور رات کی گولیوں کو انہوں نے نالی میں بہا دیا ہوگا مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ جو شخص اپنے ذاتی وقار کی خاطر رات بھر جاگ سکتا ہے اور اپنی جیب سے خرچ کر کے دوسروں کو رس گلے کھلا سکتا ہے محض اپنی ذات کی اہمیت جتانے کے لئے۔ اُس سے اُلجھنا بے کار ہے۔

جوں جوں بلی کا بچہ بڑا ہوتا گیا اشتیاق کا جذبِ دروں بڑھتا گیا۔ چند ماہ میں ہمارے سامنے ایک خوبصورت بلی صحن میں گھوم رہی تھی جس کے بال مکھن کی طرح ملائم تھے جو انتہائی میٹھی سرگوشی میں خُرڈ خُرڈ کرتی تھی اور جب گردن نیوڑھا کے آنکھیں جھپکا کے اشتیاق کی طرف دیکھتی تھی تو وہ بے چارہ دل تھام کے رہ جاتا تھا

بھی قیامت کی حرّافہ — موٹی گل گوتھنی سی۔ کبھی دھیرے دھیرے مٹک مٹک کر چلتی کبھی ایک دم چنچل ہو کر چھلانگ لگاتی اور اشتیاق کے کندھے پر جا کر بیٹھ جاتی اور پیار سے اس کی گردن چاٹنے لگتی۔ کبھی اُدن کا گولا بنی ہوئی پائنتی پر بیٹھ کر دھوپ کا مزہ لیتی کبھی اس کی باہنوں میں پوری پھیل کر لیٹ جاتی۔ عورت کی مکمل سپردگی کے ہر انداز میں۔ کبھی شریر تغافل ادا سے ایک مست انگڑائی لیتی اور جب اشتیاق اُسے پکڑنا چاہتا تو بدن چُرا کے بھاگنے لگتی اور اشتیاق ایک عجب مسرت اور حسرت سے اس کی طرف دیکھنے لگتا۔ اشتیاق نے اُس کا نام گلشن رکھا تھا مگر پیار کی محویت میں اُسے صرف گلّو کہہ کر پکارتا تھا۔

ایک دن میری غیر حاضری میں اشتیاق نے زرینہ کے بیڈ روم پر دستک دی۔

سردیوں کے دن آچلے تھے اس لیے زرینہ صبح ختم ہونے کے باوجود اپنے نائٹ گون میں ملبوس ایک سوئٹر بُن رہی تھی۔

"کون ہے؟" زرینہ نے پوچھا۔

"میں ہوں اشتیاق۔"

"اندر آجاؤ۔" زرینہ بولی۔

کاغذ پنسل لیے ہوئے اشتیاق جھجکتے جھجکتے انتہائی مودب انداز میں دروازہ سے لگ کر کھڑا ہو گیا پھر اس نے چُپکے سے کاغذ اور پنسل آگے بڑھا دیا اور بولا لکھیے:

زرینہ بولی "کیا کل کا حساب ہے، ابھی نہیں بعد میں دیکھ لوں گی۔"

"حساب نہیں ہے۔"

"پھر کیا ہے؟"

"آپ لکھیے تو۔" اشتیاق بار بار کاغذ اور پنسل آگے بڑھا رہے تھے زرینہ نے کاغذ

اور پنسل تھام کر ذرا سختی سے پوچھا۔

"آخر ہے کیا؟"

"ایک غزل کے تین شعر ہوئے ہیں۔"

زرینہ چند لمحوں کے لئے بھونچکی رہ گئی پھر اس کے دل میں ہنسی پھوٹنے لگی۔ مُسکرا کر بولی۔

"تم خود نہیں لکھ سکتے؟"

"جی نہیں۔ میں نہ لکھ سکتا ہوں نہ پڑھ سکتا ہوں۔"

"مگر شعر کہہ سکتے ہو" زرینہ نے فقرہ مکمل کیا۔

"جی! جی بالکل کہہ سکتا ہوں۔ آپ لکھئے میں بولتا ہوں۔"

"کہیے" زرینہ نے زچ ہو کر کہا۔

اشتیاق نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور ایک عجب محویت کے عالم میں بولا۔

تنہائی میرا کام ہے، گلشن تیرا نام ہے جو ہو سو ہو

ہم مرتے ہیں تجھ پر۔ تُو ڈرتی ہے مجھ سے جو ہو سو ہو

"مگر اس کی بحر کیا ہے؟ زرینہ نے پوچھا۔

"بحر؟" اشتیاق نے حیرت سے آنکھیں کھول کر پوچھا "بہر حال غزل تو غزل ہے:

"مگر اس کا وزن؟" زرینہ نے پھر توجہ دلائی۔

"بڑی وزنی غزل ہے بیگم صاحب۔ آپ لکھئے تو"، اشتیاق نے کامل دلجمعی سے کہا۔ بڑی مشکل سے زرینہ نے اپنی ہنسی روکی۔ بولی "آگے چلئے۔"

اشتیاق نے پھر آنکھیں بند کرلیں اور گہرے مراقبے میں جا کر بولے۔

تیری جدائی میں ہوئے ہم مست نگار جو ہو سو ہو
کہتا ہے تنہائی اب گلشن میں کون آیا جو ہو سو ہو

زرینہ نے پوچھا۔ کہتا ہے تنہائی ؟ مگر تنہائی تو مونث ہے !"

"مگر تنہائی تو میرا تخلص ہے اور میں مونث نہیں ہوں !" اشتیاق نے سمجھایا۔

اس کے چہرے پر کچھ ایسی مسکراہٹ تھی جیسے وہ کہنا چاہتا ہو" اجی بیگم صاحب۔ یہ شعر و شاعری ہے آپ کیا جانیں۔"

"اور یہ مست فگار۔ کہاں کی ترکیب ہے تنہائی صاحب" زرینہ نے پھر پوچھا۔

"ہمارے مرادآباد میں ایسا ہی بولتے ہیں !" اشتیاق نے جواب دیا۔

زرینہ نے اک دم کاغذ پنسل بیڈ روم کی کھڑکی سے باہر پھینک دیئے۔ گرج کر بولی "اشتیاق اگر آج کے بعد تو نے کبھی مجھے اپنا کوئی شعر سنایا تو کھڑے کھڑے گھر سے باہر نکال دوں گی" اشتیاق نے کھسیا کر سر جھکا لیا، پھر سر کھجانے لگے۔ بے حد محجوب اور شرمندہ سے دکھائی دے رہے تھے۔ زرینہ کو اس پر رحم آگیا نرم لہجہ میں مسکرا کر کہنے لگی۔

"میرے خیال میں اگر آپ شعر و شاعری چھوڑ کر ناول نگاری کی طرف توجہ کریں تو بہتر ہوگا"

فوراً سر اٹھا کر بولے۔ ایک ناول بھی تیار کر رہا ہوں"

"کیا نام ہے اس ناول کا ؟" زرینہ نے پوچھا۔

"لائف اینڈ لگ" اشتیاق انگریزی میں بولے۔

اشتیاق کی انگریزی ایسی تھی جیسے پرانے زمانے میں اُن باورچیوں کی ہوا کرتی تھی جو انگریزوں کے پاس کام کرتے تھے یا آج کے اُن مزدوروں کی جو اَن پڑھ ہونے کے

باوجود ٹیکنیکل دھندوں میں پڑجاتے ہیں۔ یہ انگریزی بڑی مختصر اور جامع ہوتی ہے اور بالعموم مصدر کی محتاج نہیں ہوتی مگر اپنا مفہوم ادا کرنے میں اُس انگریزی سے کہیں بہتر ہوتی ہے جسے آج کل کے طالب علم میٹرک تک پڑھتے ہیں۔

ایک دن جب اشتیاق میرے سر کی چمپی سے فارغ ہو چکا تو میں نے اس سے کہا "تم اتنے ڈھیر سارے دھندے جانتے ہو لیکن اگر تم کسی ایک دھندے کو پکڑ کر بیٹھ جاتے تو غالباً بہت ترقی کر جاتے۔"

"صاحب! میرا کسی کام میں زیادہ دیر تک جی نہیں لگتا۔" اشتیاق ایک چھوٹے سے تولیہ سے اپنے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولا۔ سال چھ ماہ ایک دھندا کیا پھر دوسرے میں چلا گیا اسی طرح زندگی کے پینتیس چھتیس برس گزار دیئے ہیں۔ باقی بھی ایسی ہی گزر جائے گی۔"

"تو تم کسی ایک دھندے میں جی کیوں نہیں لگاتے۔" میں نے پوچھا!

"جی نہیں لگتا۔" اشتیاق سر جھکا کر کسی اقبالی مجرم کی طرح شرمندہ ہو کے کہا۔

"میرا سینہ ہر وقت خالی خالی سا رہتا ہے۔"

"میاؤں۔"

دروازہ پر گُگو تشریف لائیں اور وہ مُنہ اُٹھا کے بڑی بڑی آنکھوں سے اشتیاق کی طرف دیکھنے لگی۔ اشتیاق نے اُسے گود میں اُٹھا لیا اور اس کے بالوں پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "گُگو بھوکی ہے اُسے دودھ دے آؤں۔"

"جاؤ۔"

اشتیاق پر کبھی کبھی ذہنی غشی کے لمبے لمبے دورے پڑتے تھے، جبکہ وہ گھنٹوں اپنے خیالوں میں ڈوبا ہوا کچن میں غائب بیٹھا رہتا تھا۔ جانے کیا سوچتا ہے۔ خود ہی مُسکراتا ہے،

خود ہی گھورتا ہے خود ہی سسکنے لگتا ہے، کبھی کبھی مُنہ میں بڑبڑانے لگتا ہے۔ کیا گزرتی ہے، اس پر۔ وہ کون سا کرب ہے جو اسے اندر ہی اندر کھائے جاتا ہے۔ کون جانے، کچھ بتاتا تو ہے نہیں۔ کبھی کبھی نشہ بھی کرتا ہے۔ قیاس غالب ہے کہ جب دِل کی گھٹن اور سینے کا سُونا پن حد سے گزرنے لگتا ہے تو کوئی نشہ ضرور کرتا ہے۔ کیونکہ مہینے میں ایک دو دن ایسے آتے ہیں جب اشتیاق کوئی کام نہیں کر سکتا۔ سارا دن تقریباً نیم غشی کی حالت میں اپنی چارپائی پر پڑا رہتا ہے اور اس کا سینہ دھونکنا رہتا ہے اور دو دن کے بعد جب وہ ہوش میں آجاتا ہے تو اصرار کرتا ہے کہ نہ دن بدلا ہے نہ تاریخ بدلی ہے، نہ اُس نے کوئی نشہ کیا ہے اور ہم بھی اس لئے چپ رہتے ہیں کہ اپنا کام بہت اچھا کرتا ہے۔ ماہر ہی نہیں آرٹسٹ ہے اپنے کام کا۔ اور فنکاروں کے دماغ کی ایک چوُل تو ڈھیلی ہوتی ہی ہے۔ یہ سب جانتے ہیں۔

اس لئے کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ اس سے کہا حیدر آبادی بگھن بنائے اور وہ لے آیا کچھ عجیب سی ڈِش — جس میں شوربہ پانی کی طرح پتلا تھا اور اس کے اندر بگھن کے کالے کالے ٹکڑے مرے ہوئے چوہوں کی طرح تیر رہے تھے۔

"یہ حیدر آبادی بگھن ہیں۔" زرینہ چیخ کر پوچھتی ہے۔

"جی نہیں یہ چائنا ٹاؤن ہے۔" اشتیاق کہتا ہے "یہ بالکل نئی ڈِش ہے، کھا کے دیکھئے سمجھئے، چکھئے، بالکل نیا مزا ہے۔"

"اُٹھا کے لے جا ابھی ابھی یہاں سے ورنہ تیرے سر پر دے ماروں گا!" میں گرج کر کہتا ہوں کیونکہ مجھے تو اِس ڈش کو دیکھ کر ہی متلی ہونے لگی تھی۔

اُس وقت تو اشتیاق ڈِش اُٹھا کر لے گیا۔ مگر بعد میں اُس نے زرینہ سے کہا "صاحب بھی کیسی ناانصافی کرتے ہیں۔ چکھے بغیر ناپاس کر دیتے ہیں کھانے کو۔"

اشتیاق موتی قلیہ بہت عمدہ پکاتا ہے۔ ایک دفعہ گھر پر مخصوص مہمانوں کی دعوت تھی۔ اشتیاق سے موتی قلیہ پکانے کی فرمائش کی گئی، جب دسترخوان بچھا تو منجملہ دوسری چیزوں کے ایک نہایت بدبودار اور سڑی ہوئی ڈش سامنے آئی۔

"یہ موتی قلیہ ہے۔" زرینہ نے حیرت سے پوچھا۔

"جی نہیں،" اشتیاق فوراً بولے "یہ پیسٹ ہے۔"

"پیسٹ کیا؟ تمہیں تو موتی قلیہ تیار کرنے کو کہا تھا، کہا تھا کہ نہیں! زرینہ خفا ہو کے بولی۔

"جی۔ موتی قلیہ بگڑ گیا۔ اس لیئے میں نے نئی ڈش تیار کر دی تھی۔" اشتیاق کی یہ عادت اب ہمیں معلوم ہو چکی ہے کہ جب کوئی سالن بگڑ جاتا ہے وہ فوراً اُسے کوئی نیا نام دے کر دسترخوان پر پیش کر دیتے ہیں اور ڈش کے بگڑنے کا یوں تذکرہ کرتے ہیں جیسے کسی اعلیٰ خاندان کا لڑکا خود بخود بگڑ جائے اور اُس کے بگاڑنے میں اُن کا کوئی ہاتھ نہ ہو۔

اب کیا کہیں۔ چند ایسے مہمانوں کی دعوت تھی جن کے سامنے میں بے تکلف نہ ہو سکتا تھا ورنہ آج میرا ارادہ اشتیاق سے بے تکلف ہونے کا تھا۔ مگر مہمان موجود تھے اور دوسرے سالن بے حد عمدہ تھے اس لیئے خاموش رہ جانا پڑا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد ہم اپنے مہمانوں کو لے کر میٹنی شو دیکھنے چلے گئے اور چلتے چلتے زرینہ نے اشتیاق کو رات کے کھانے کے متعلق ہدایات دے دیں۔ میٹنی شو دیکھ کر جب ہم شام کو واپس آئے تو دیکھا کہ گھر کے باہر فائر بریگیڈ کھڑا ہے۔ بہت سے لوگ جمع ہیں اور کچن کی چمنی اور چھت اور کھڑکیوں سے دھوئیں کے بادل اُٹھ رہے ہیں۔

"آگ، آگ میرا گھر بچاؤ۔ سینٹ لارڈ زور زور سے چیخ رہا تھا۔

"اشتیاق کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کیا معلوم" سینٹ لارڈ اپنے سر کے بال نوچتے ہوئے بولا "ایک گھنٹہ سے چیخ رہا ہوں دروازہ ہی نہیں کھولتا اندر کچن میں شاید نشہ کرکے بے ہوش پڑا ہے۔"

میں نے اور زرینہ نے۔ دونوں نے چلا چلا کر اشتیاق سے دروازہ کھلوایا۔

اشتیاق بے حد حیرت زدہ کچن سے نکلے اور دھواں دیکھ کر پلٹے اور کچن کی دونوں انگیٹھیوں پر پانی ڈال کر بجھانے لگے۔ دونوں پتیلیوں کے سالن جل چکے تھے۔ مگر خدا جانے ان میں اس نے کون سا مسالحہ ڈالا تھا کہ دھوئیں کے گہرے سیاہ بادل اب تک ان پتیلیوں سے اُٹھ رہے تھے۔

"آگ آگ" سینٹ لارڈ غصہ سے چیخ رہا تھا۔

"کدھر ہے آگ؟" اشتیاق حیرت سے پُوچھنے لگا۔

زرینہ بولی۔ "یہ بے چارے ایک گھنٹہ سے چیخ رہے ہیں دروازہ پیٹ رہے ہیں اور تمہیں کچھ پتہ ہی نہیں۔ فائر بریگیڈ تک آیا اور تم کچن کا دروازہ بند کئے غافل بیٹھے ہو۔"

اشتیاق سب لوگوں کو متوجہ دیکھ کر کچھ چونکے۔ شرمندہ ہو کر سر جھکانے لگے۔ ایک اُنگلی اپنی کھوپڑی پر رکھ کر بولے۔

"بحث چل رہی تھی۔"

"کیسی بحث؟" زرینہ کا پارہ چڑھنے لگا۔ "تم تو یہاں اکیلے بیٹھے ہو۔"

"کورٹ میں مقدمہ تھا۔"

"کیسا مقدمہ؟"

"آبائی مکان کا مقدمہ تھا۔ میرے اور چچا زاد بھائی لطیف کے درمیان۔ وکیل استغاثہ

اور وکیل صفائی میں بحث ہو رہی تھی ۔

"کدھر ہے وکیل استغاثہ اور وکیل صفائی ؟" زرینہ کے غصہ کا پارہ چڑھنے لگا۔ "میں خود دونوں طرف سے وکیل ہوں۔ خود ہی کورٹ ہوں خود ہی مدعی، خود ہی مدعا علیہ، خود ہی بحث کرتا تھا، خود ہی جواب دیتا تھا۔" اشتیاق نے بتایا۔

"مگر کہاں بحث چل رہی تھی؟" زرینہ نے دانت پیس کر پوچھا۔

"یہاں" اشتیاق نے اپنی کھوپڑی پر انگلی رکھ کر کہا اور سر جھکالیا۔

زرینہ کا دل اشتیاق سے ہٹنے لگا۔ میرا بھی! عمدہ باورچی ہونے کے باوجود اُس کی خامیاں اب جان لیوا ثابت ہونے لگیں۔ اودھر اشتیاق سے زیادہ اُس کی بلّی بی گلشن نے مجھے عاجز کر دیا۔ میں دراصل اشتیاق کی وجہ سے اُس سے بے اعتنائی تو برتتا تھا کیونکہ اشتیاق نہیں چاہتا تھا کہ اُس کے سوا کوئی دوسرا اس کی بلّی پر توجہ دے۔ مگر غالباً گلشن کو یہ بات پسند نہ تھی۔ وہ مجھے بھی اپنے مداحوں کی فہرست میں شامل کرنے پر مُصر تھی۔ دو ایک بار وہ میرے کمرے میں اٹھلاتی ہوئی آئیں مگر میں نے ہِشش کہہ کر بھگا دیا۔ پھر میری غیر حاضری میں ایک بار وہ میرے بستر پر چڑھ کے سوگئیں۔ دراصل سوئی نہ تھیں سونے کا بہانہ کر رہی تھیں۔ وقت بھی بی گلشن نے وہ چُنا تھا جو میرے دفتر سے آنے کا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ دیکھو ہم تو تمہارے بستر پر چڑھ کے سوئیں گے اور اگر تم اسے برداشت کر گئے تو دوسری بار تمہارے سینے پر چڑھ کے سوئیں گے۔ یعنی جس قدر میں بے اعتنائی دکھا رہا تھا اسی قدر وہ مجھے اپنے قریب لانے پر مُصر تھیں۔ اس وقت میں نے جو اُنہیں بستر پر سوئے ہوئے دیکھا تو غصہ میں آکر اُنہیں دُم سے پکڑا اور بستر سے نیچے پھینک دیا۔ بے حد خفا ہو کر غرّائیں اور جھلا کر کمرہ سے باہر چلی گئیں مگر اس کا بدلہ گلشن نے یوں لیا کہ دوسرے دن دفتر سے جو آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے کمرہ میں کمبل کی ریشمی

رُوئی کے دونوں تکیے اُدھڑے پڑے ہیں اور گلشن اُنہیں پنجے مار مار کر نوچ رہی ہے اور سمبل کو ہوا میں اُڑا رہی ہے۔

میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ جھپٹا مارنے کے لئے آگے جو بڑھا تو گلشن چھلانگ لگا کر دروازہ سے باہر، اور بی چلّانے لگی، "میاؤں! میاؤں!" مگر آج میں نے بھی قسم کھالی تھی۔ آج میں اس حرّافہ کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں نے صحن کا دروازہ بند کر دیا اور ڈرائنگ روم سے بیڈ روم اور ڈرائنگ رُوم سے، کچن سے، صحن سے باتھ رُوم تک گلشن کے پیچھے پیچھے بھاگ کر آخر میں نے اُسے پکڑ لیا اور دونوں ہاتھوں سے دبا کر اُسے گھر سے باہر لے چلا۔ اشتیاق سہا ہوا میرے پیچھے پیچھے آنے لگا مگر میرے غصّہ کو دیکھ کر مُنہ سے کچھ بول نہیں رہا تھا۔ صرف اُس کے ہونٹوں کے کونے پھڑک رہے تھے۔

بڑی سڑک پر آ کر میں ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔ اس سڑک پر کئی کوڑے اور گڑھے تھے اور اس پر اَن گنت وزنی ٹرک گھُوں گھُوں کرتے ہوئے گُزرتے تھے۔ میں نے ایک ٹرک کو قریب آتے ہوئے دیکھ کر یکایک گلشن کو زور سے جھلایا اور نشانہ باندھ کر گُزرتے ہوئے ٹرک کے نیچے پھینک دیا۔ اشتیاق کے گلے سے ایک گھُٹی ہوئی چیخ نکلی۔

ٹرک سڑک پر سے گُزر گیا۔ چند لمحوں تک ایسا محسوس ہوا جیسے گلشن سڑک پر پس کر بھی لیٹی ہے۔ پھر یکایک وہ چونک کر کھڑی ہوئیں اور بجلی کی سُرعت سے چھلانگ لگا کر سڑک کو پار کرتی ہوئی مخالف سمت چلی گئی اور پھر کبھی ہمارے گھر نہیں آئی۔

تین دن تک اشتیاق نے انتظار کیا مگر گلشن کہیں نظر نہیں آئی۔ چوتھے دن اس نے سامان باندھ لیا اور بولا: "صاحب میرا حساب کر دیجئے میں جانا چاہتا ہوں۔"

"کیوں۔ تمہیں یہاں کیا تکلیف ہے؟" زرینہ نے پوچھا۔

اشتیاق نے مجھ سے آنکھیں چُرا کے زرینہ سے کہا "بیگم صاحب جس طرح صاحب نے میری بلّی کے ساتھ سلوک کیا ہے وہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔"

"اور وہ جو تمہاری بلّی نے میرے چالیس روپے کے دو قیمتی تکیے پھاڑ ڈالے ہیں اس کا ہرجانہ کون دے گا!" میں نے غصّہ سے بلند آواز میں کہا۔

زرینہ معاملے کو سُلجھانے کے خیال سے بولی۔ "ارے ایک بلّی کی وجہ سے لگی لگائی نوکری چھوڑتا ہے۔ میں تجھے ایسی ایسی دس بلّیاں لادوں گی۔"

"نہیں۔ وہ تو میری گُلشن تھی۔" اشتیاق کی آواز کمزور ہو کر لرزنے لگی جیسے وہ ابھی رو دیگا۔

"ارے گُلشن تھی کہ زُلفن کہ کریمن جو نام چاہے رکھ لینا۔" میں نے بھی اُسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "سینکڑوں بلّیاں گھومتی ہیں اس علاقہ میں۔"

اشتیاق نے پھر نظریں چُرا کر مجھ سے رُخ موڑ کر زرینہ کی طرف دیکھا۔ بولا!

"مجھے صاحب سے بڑا ڈر لگتا ہے اب تو۔"

"کیوں؟" زرینہ نے پوچھا۔

"جب صاحب نے گُلشن کو اُٹھا کر سڑک پر پھینک دیا تو مجھے ان کا چہرہ بالکل اپنے باپ کی طرح نظر آیا۔"

"اپنے باپ کی طرح؟ کیا بکتے ہو؟" زرینہ غصّہ سے بولی۔

اشتیاق نے ایک دو لمحہ توقف کیا پھر گھمبیر لہجہ میں کہنے لگا۔ "اسی طرح میرے باپ نے ایک دن نشہ کی حالت میں مجھے کمرے سے اُٹھا کر باہر سڑک پر پھینک دیا تھا۔ اس وقت میری عمر صرف چار سال کی تھی۔ میں یقیناً مر جاتا مگر سڑک پر جہاں میں گرا اس پر ایک بڑا سا گڈھا تھا اور میں اُس گڈھے سے باہر نہیں نکل سکا۔ اور رات کا وقت تھا اور دو ایک ٹرک پرے

سے پرے گزر گئے پھر شاید میں بے ہوش ہو گیا۔ میری ماں دوہتڑ مار کر چیخنے لگی۔ یکایک میرے باپ کو ہوش آ گیا اور وہ بھاگا بھاگا آیا اور سڑک کے گڈھے سے مجھے اُٹھا کے اپنے سینے سے لگا کے گھرلے گیا اور وہ میرا منہ چومتا تھا اور زور زور سے روتا تھا اور کبھی میری ماں مجھے اُس سے چھین کر اپنے سینے سے لگا لیتی تھی اور کبھی میرا باپ مجھے میری ماں سے لے کر اپنی چھاتی سے لگا لیتا تھا۔ مگر میں اس کا وہ چہرہ کبھی نہیں بھول جب اُس نے مجھے غصّہ میں اپنے ہاتھوں سے اُٹھا کر سڑک پر پھینک دیا تھا۔ بالکل ایسا ہی چہرہ تھا۔ اس وقت صاحب کا۔ اس لئے میرا حساب کر دو میں یہاں نہیں رہوں گا۔"

اشتیاق میرے پاؤں کو ہاتھ لگانے لگا۔ جیسے اپنی گستاخی کی مجھ سے معافی مانگ رہا ہو۔

زرینہ نے اس کا حساب کر دیا۔

تین سال کے بعد جب ہمارا تبادلہ بمبئی میں ہو گیا تو وہ ہمیں بمبئی میں ملا۔ ہمیں ایک گھر کی تلاش تھی اور اشتیاق ایک ہاؤس ایجنٹ تھا۔ اور اس کا نام اب لالو کرمانی تھا۔ اور وہ سندھی تھا اور سندھی زبان وہ بڑے فراٹے سے بولتا تھا۔ وہ کھدر کا پائجامہ اور کھدر کا ایک لمبا کرتہ پہنتا تھا۔ اور پہلی نظر میں کسی محلہ کمیٹی کا کانگریسی نیتا معلوم ہوتا تھا۔

"یہ کیا ڈھنگ ہیں تمہارے یہاں پر؟" زرینہ نے اپنے دونوں ہاتھ اُٹھا کر اس سے پوچھا۔

"اِدھر — ا — بلڈنگ کا اکھا دھندا سندھی لوگ کے پاس ہے اس لئے ہم بھی سندھی بن گیا ہے بیگم صاحب! کیا کریں پیٹ روٹی مانگتا ہے۔"

"کوئی بلی وِلی پال رکھی ہے ادھر بھی؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

وہ شرمندہ سا ہو گیا آنکھیں جھپکاتے ہوئے بولا "صاحب ادھر بمبئی میں جندہ رہنا بھی مشکل ہے۔ ایک ایرانی ہوٹل کے مالک نے ترس کھا کر میرا ٹرنک اور بستر اپنے باورچی خانہ میں

رکھنے کی اجازت دے دی ہے۔ رات کو اس کی دوکان کے سامنے پڑ رہتا ہوں۔ صبح گیارہ بجے تک اس کی دوکان میں سموسے بناتا ہوں۔ پھر رام داس ماکی جانی کے دفتر میں جاتا ہوں۔

"یہ ماکی جانی کون ہے؟ زرینہ نے پوچھا۔

"اصل میں ہاؤس ایجنٹ تو وہی ہے۔ میں اُس کا دوسرا اسسٹنٹ ہوں۔"

"تم کو کیا ملتا ہے؟"

"کمیشن ملتا ہے۔"

"کتنا؟"

"ماکی جانی کو ٹوئنٹی فایو پرسنٹ ملتا ہے۔ پہلے اسسٹنٹ کو فایو پرسنٹ ملتا ہے۔" اشتیاق انگریزی بگھارنے لگے۔ "ہم کو ون پرسنٹ!"

"ون پرسنٹ؟" زرینہ نے پوچھا۔ "ون پرسنٹ آف واٹ!

اشتیاق بولے "ون پرسنٹ آف دی فایو پرسنٹ آف دی ٹوئنٹی فایو پرسنٹ آف دی ہنڈرڈ پرسنٹ!

زرینہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوگئی۔ اشتیاق خود بھی بے حد محظوظ ہوئے۔ آخر جب زرینہ نے کسی طرح سے اپنی ہنسی پر قابو پالیا تو بولے۔

"آپ کو ایک فلیٹ دے سکتا ہوں۔"

"کیسا ہے وہ فلیٹ؟"

اشتیاق اُنگلی پر گرے گنواتے ہوئے بولے "ون بیڈ رُوم، ون باتھ رُوم مور، ون کچن، ون ہال اینڈ سپریٹیس۔"

"یہ and separates کیا بلا ہے؟" زرینہ نے پوچھا۔

"یس اینڈ سپریٹس!" اشتیاق نے اس طرح حیرت سے زرینہ کی طرف دیکھا۔
گویا کہہ رہا ہو ایم اے کرنے کے باوجود اتنی معمولی سی انگریزی نہیں سمجھ سکتیں آپ!

"اینڈ سپریٹس!" بیگم صاحب اشتیاق نے پھر سمجھایا۔

زرینہ نے یکایک سمجھ کر کہا "اچھا تمہارا مطلب ہے آل سپریٹس یعنی ہر کمرہ دوسرے سے الگ الگ ہے۔"

"یس اینڈ سپریٹس۔" اشتیاق کے چہرہ پر احساسِ برتری کی ایسی جھلک آئی گویا کہہ رہا ہو۔ افوہ کتنی دیر سے بات آپ کی سمجھ میں آئی ہے۔

زرینہ پھر ہنسنے لگی۔ میں نے بات ٹالنے کی غرض سے کہا "اور بھی کچھ کام کرتے ہو؟"

"جی ہاں۔ ایک ٹوتھ پیسٹ تیار کیا ہے۔ میری ٹوتھ پیسٹ۔"

"یہ میری کون ہے۔" زرینہ نے چونک کر پوچھا۔

شرما کر بولے "ایک چھوکری ہے!"

"تمہاری منگیتر؟"

"جی نہیں۔" سر ہلا کر بولے "ہمارے ہوٹل میں ایک عیسائی بڑھیا کام کرتی ہے اس کی چھوکری ہے۔ کوکن کے گاؤں میں یہ بڈھی اپنی چھوکری کی شادی بناتا ہے۔"

"تمہارے سنگ؟" زرینہ نے خوش ہو کر پوچھا۔

"نہیں۔ کسی عیسائی چھوکرے کے سنگ۔ الیفرڈ اس کا نام ہے وہ بھی اُدھر کوکن کے گاؤں میں رہتا ہے مگر بڈھی بہت گریب ہے۔ اس کے پاس پیسہ نہیں ہے اس لئے ہم نے میری ٹوتھ پیسٹ نکالا ہے اور اس کو شام کے ٹائم میں بیچتا ہے اور اس کا پیسہ اس کرسچن بڈھی کو دیتا ہے۔"

"تاکہ اپنی چھوکری کی شادی تمہارے سوا کہیں اور کر سکتے ؟" زرینہ نے بے حد تلخ ہو کر پوچھا۔ یکایک اشتیاق سٹپٹا گیا اُس کی آنکھوں کی پُتلیاں جلدی جلدی گھومنے لگیں۔ اس کے ہونٹوں کے کونے تیزی سے پھڑکنے لگے اور گال اور بھی اندر کو دھنستے گئے اور اس کا چہرہ ایک ایسی کالی کھوپڑی کی طرح نظر آنے لگا جس پر صرف کھال ہی کھال منڈھی ہو۔ مجھے اس کو دیکھ کر بہت رحم آیا وہ اس وقت زرینہ سے نظریں چُرا کر یوں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے چاروں طرف سے دیواریں اُس پر گر رہی ہوں اور اُس کے بچ نکلنے کا کہیں کوئی راستہ نہ ہو۔

میں نے جلدی سے بات کا رُخ پھیرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"شعر و شاعری جاری ہے ؟"

اُس نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"کیوں ؟" میں نے پوچھا۔

"اب تو ایک فلمی کہانی لکھ رہا ہوں۔" اشتیاق نے بڑے فخر سے اعلان کیا۔ وہ اب اپنی گھبراہٹ پر قابو پا چکا تھا۔

"ہیرو کون ہے ؟" میں نے پُوچھا۔

"اشتیاق !" اپنا نام لے کر بولے "ڈبل رول ہے اشتیاق کا اس پکچر میں۔"

"اور وِلن کون ہے ؟" زرینہ نے پُوچھا۔

"شاید دلیپ کمار نبھا جائے !" اشتیاق سوچ سوچ کر بولے "وِلین کا رول بہت مشکل ہے۔"

زرینہ نے ہنسی روکنے کے لئے اپنے مُنہ میں دوپٹہ ٹھونس لیا۔

"اور ہیروئن ؟" میں نے پوچھا۔

"فلم انڈسٹری میں تو کوئی ہے نہیں۔" اشتیاق سنجیدہ ہو کر بولے۔ "باہر دیکھ رہا ہوں۔"

"فلم انڈسٹری میں کوئی نہیں ہے۔" میں نے پوچھا۔ پھر اُسی کا انگریزی فقرہ میں نے دُہرا کر پوچھا۔

"نو سر۔" اشتیاق نے سر ہلا کر کہا۔

"تو اس فلم کے گانے کون لکھے گا؟ تم نے تو شاعری ترک کر دی ہے۔

"جی!" اشتیاق اپنے ہاتھ کے ایک ناخن کو دوسرے ناخن سے کریدتے ہوئے بولے۔ "شاعری تو چھوڑ دی ہے مگر اس فلم کے گانے تو میں ہی لکھوں گا۔ ایک مُکھڑا کہا ہے۔

"کیا؟"

نگاہیں نیچی کئے آنکھوں کے کونوں سے ڈرتے ڈرتے چور نگاہوں سے زرینہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ صاحب بات یہ ہے کہ غزل سے بیگم صاحب نے ہم کو بہت ڈرا دیا تھا کہ اس کا وزن بہت بڑا ہوتا ہے اس لئے ہم نے غزل کو چھوڑ دیا مگر فلمی گیت میں ہم دیکھتے ہیں کہ اس کا وزن چھوٹا ہوتا ہے۔ کیا مطلب کہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہوتے ہیں اور بیچ بیچ میں میوزک ہوتا ہے۔ اس لئے ہم نے ایک فلمی گیت شروع کیا ہے۔ اس طرح چھوٹے چھوٹے ٹکڑے والا۔

"تو سناؤ۔" میں نے بے چین ہو کر کہا۔

اشتیاق نے کھنکار کے گلا صاف کیا۔

او صنم! او صنم!

مَیں نے لیا۔

اُلو کا جنم۔

او صنم۔

تیرے لئے۔

زرینہ کی بُری حالت تھی۔ منہ میں دوپٹہ ٹھونستے ہوئے اس کا چہرہ لال ہوتا جارہا تھا۔ بڑی مُشکل سے میں نے اپنی ہنسی روکی اور اس سے پُوچھا۔

"مگر اُلو کا جنم کیوں اشتیاق؟" روکنے کے باوجود میری ہنسی میرے سوال سے باہر چھلکی پڑتی تھی۔

"اُلو کا جنم اس لئے صاحب۔" اشتیاق نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "کہ اشتیاق کو یعنی فلم کے ہیرو کو رات میں نیند نہیں آتی ہے۔ ہیروئن کے فراق میں...... ہیروئن کے فراق میں رات رات بھر جاگتا ہے اور اُلو بھی رات کو جاگتا ہے اس لئے...... بات کو بجھیئے ذرا۔ ذرا سوچیئے۔ کیا گہری حقیقت بیان کیا ہُوں۔"

"ارے اُلو کے پٹھے!" زرینہ نے دوپٹہ منہ سے نکال کر یکایک چیخ کر کہا۔ "بھاگ جا یہاں سے ورنہ اپنی چپل اُتار کر اتنے ماروں گی، اتنے ماروں گی کہ...."

زرینہ چپل اُتارنے لگی۔

اشتیاق بھاگ کھڑا ہوا۔

اشتیاق کا کاروبار ایرانی ہوٹل والے کے ہاں خوب چمک گیا۔ پہلے وہ صرف سموسے بناتا تھا پھر اُس نے ایرانی ہوٹل کے مالک کو ڈھرے پر لگا کر اُسے شاہی ٹکڑے بیچنے کی

ترغیب دی۔

"بہت سستے میں بن جائے گا سیٹھ تمہارے ادھر۔ ڈبل روٹی کا کتنا ٹکڑا بے کار میں پھینکتا ہے۔ ہم اس کو کام میں لائے گا۔ خالی شکر کا خرچ ہے اور تھوڑی سی بالائی"۔ اشتیاق نے اُسے سمجھایا۔ اور تمہارے پاس تین تین ریفریجریٹر ہے۔ ایک ریفریجریٹر میں شاہی ٹکڑا رکھے گا۔ گاہک کو ٹھنڈا ٹھنڈا سرو کرے گا۔" ایرانی مان گیا کیونکہ خرچہ بہت کم تھا اس مٹھائی کا۔ پہلے دن اشتیاق نے جو شاہی ٹکڑا بنایا تو وہ دو آنے فی ٹکڑے کے حساب سے ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ ایسی عمدہ ڈش جس سے پیٹ بھی بھرے اور مٹھائی کی مٹھائی بھی معلوم ہو ایرانی ہوٹل میں بیٹھنے والوں نے آج تک کاہے کو کھائی تھی۔ اب تو یہ حالت ہوگئی کہ اشتیاق کو دن میں دو بار شاہی ٹکڑے تیار کرنے پڑتے اور بکری کو بڑھتے دیکھ کر ایرانی ہوٹل کے مالک نے اشتیاق کو اپنے کچن کا ہیڈ ٹنگ مقرّر کر دیا۔ کچن میں کام کرنے والے نوکر اب اشتیاق کو اُستاد جی کہہ کر پکارتے تھے۔ اور ہوٹل کا مالک اشتیاق کو شاہی ٹکڑے کی مناسبت سے میرے دل کا ٹکڑا کہتا تھا۔

اگر میں نے کبھی اشتیاق کے جسم اور رُوح پر بہار آتے ہوئے دیکھی ہے تو وہ یہی دن تھے،۔۔۔۔ اس کے گلے بھرنے لگے اور کالے رُخساروں پر صحت کا اودا پن جھلکنے لگا۔ اور وہ کشتیاں اس کی پتلیوں کی جو اس کی آنکھوں میں ہر وقت بے چین اور مضطرب ہو کر تیرتی سی رہتی تھیں اب بمبئی کے ساحل پر لنگر ڈالتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ جہاں اشتیاق نے ہمیں مکان دلوایا تھا اس کے قریب کوئی ایک فرلانگ کے فاصلہ پر وہ ایرانی کا ہوٹل تھا۔ چوک کے نکڑ پر، سامنے ٹیکسیوں کا اڈہ تھا اور قریب ہی ایک نئی مارکیٹ کھُل گئی تھی اس لئے صبح سے شام تک اس ایرانی ہوٹل میں بڑی بھیڑ رہتی تھی۔ بوٹ پالش کرنے والے اور پان بیچنے والے اور بھیل پوری کی چاٹ بیچنے والے اور آس پاس کے گھروں اور بنگلوں

کے نوکر چاکر اور کالجوں کے ٹیڈی بوائز اور کام کی تلاش میں گھومنے والے بے کار اور آوارہ گرد لونڈے جو کالج کے لڑکوں سے زیادہ ٹیڈی معلوم ہوتے تھے اُن سب کا جمگھٹا اس ہوٹل کے اندر اور باہر رہتا تھا۔ اور اس ہوٹل میں اشتیاق بہت پاپولر ہو گیا تھا آتے جاتے میں اُسے دیکھتا تھا۔ سہ پہر تک تو وہ اپنے بھیگے کپڑوں میں کبھی کچن کے باہر بڑی مستعدی سے کام کرتا دکھائی دیتا۔ کوئی چار بجے کے قریب وہ نہا دھو کر گیروے رنگ کا بنگالی کرتا اور اس کے نیچے کھلے پائچوں والا پاجامہ اور چپل پہن کر ایرانی ہوٹل کے باہر آ کھڑا ہوتا۔ اُس وقت اُسے کام کی تلاش میں آتے ہوئے اِدھر اُدھر سے بہت سے لونڈے گھیر لیتے۔ وہ اِدھر اُدھر کے بنگلوں اور فلیٹوں میں اُن لڑکوں کو نوکر کرا دیتا۔ کیونکہ ہاؤس ایجنٹ کا اسسٹنٹ ہونے کی وجہ سے آس پاس کی بلڈنگوں میں اُس کی خاصی جان پہچان ہو گئی تھی۔ جن لونڈوں کو وہ نوکری نہ دلوا سکتا انہیں دوسرے دن آنے کا مشورہ دے کر چلتا کرتا۔ پھر بیڑی سلگا کر ٹیک لانڈری کے مالک سے باتیں کرتا جو اس کا ہم وطن تھا یعنی مُراد آباد کا رہنے والا تھا اور جس کے لئے وہ ایک نہایت ہی عمدہ اور نہایت ہی سستی قسم کا ایسا صابن بنانا چاہتا تھا جس میں خرچہ بہت کم ہو اور کپڑے بھی بہت عمدہ دُھل جائیں مگر اشتیاق ابھی اپنی ایجاد میں کامیاب نہ ہوا تھا۔

ٹیک لانڈری سے فارغ ہو کر وہ اپنے ہاؤس ایجنٹ کے ہاں چلا جاتا یا نئے گاہکوں کو لے کر مکان دکھانے کے لئے چلا جاتا۔ رات کو نو دس بجے فارغ ہو کر ایرانی ہوٹل میں کھانا کھاتا پھر ایک کپ چائے پی کر اور پھر بیڑی سُلگا کر اور پان کھا کر وہ سنتو باورچی کے جھونپڑے میں جا کر سو رہتا کیونکہ اب وہ بڑا آدمی ہو گیا تھا۔ وہ اب ایرانی ہوٹل کے باہر نہیں سو سکتا تھا۔ سنتو باورچی کے بارہویں نمبر کی سڑک کے پیچھے ایک چھوٹے سے خالی پلاٹ پر تھا اور

اس کی بیوی بچہ ہونے کے لئے اپنے میکے ٹیڑھی گڑھوال کے کسی گاؤں میں گئی ہوئی تھی اور کہیں چار ماہ کے بعد واپس آنے والی تھی، تب تک اشتیاق سنتو کے جھونپڑے میں رہ سکتا ہے سنتو نے اُستاد جی سے کہا تھا۔

شاہی ٹکڑوں کی روز افزوں بکری کو دیکھ کر میں نے اندازہ کیا تھا کہ اب اشتیاق کے قدم یہاں جم جائیں گے۔ اس لئے دو ماہ کے بعد مجھے بڑی حیرت ہوئی جب ایرانی ہوٹل کے مالک نے مجھے بتایا کہ اُس نے اشتیاق کو نکال دیا ہے۔

"کیوں؟" میں نے پُوچھا "کوئی غبن کیا"

"نہیں۔ آج تک ایک پیسہ کا غبن نہیں کیا" ایرانی ہوٹل کا مالک بولا۔

"پھر کیا کام میں گڑبڑ کرتا ہے۔؟"

"نہیں۔ کام تو اشتیاق بہت اچھا کرتا تھا"

"پھر؟"

ایرانی ہوٹل کے مالک نے کچھ کہنے کے لئے مُنہ کھولا پھر جلدی سے بند کر لیا پھر ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بولا "اُس کا بھیجا پھرِیلا ہے ہم اُس کو ستر روپیہ پگار دیتا تھا وہ پگار بھی اُس نے خرچ کر دیا اُوپر سے پانچ کپ چائے اور دو سو سلائیس کا بل ہو گیا"

"پانچ سو کپ چائے اور دو سو سلائیس؟" میں نے حیرت کہا "اشتیاق تو اتنا پیٹو کبھی نہ تھا وہ تو بہت ہی کم خوراک کھاتا تھا۔

"ہم جانتا ہے اس لئے تو ہم بولتا ہے" ایرانی ہوٹل کا مالک خفا ہو کے بولا" وہ خود پانسو گیا سات سو کپ چائے پیتا تو ہم اس کو منع نہیں کرتا تھا مگر وہ خود نہیں پیتا تھا اِدھر اُدھر کے بے کار اور لفنگے لونڈا لوگ کو جو اِدھر آجو باجو کی بلڈنگوں میں نوکری بنانے کے واسطے

آتا ہے وہ اُن کو بھوکے پیٹ دیکھ کر چائے پلاتا تھا۔ جب ہم منع کرتا تھا تو بولتا تھا، میرے حساب میں لکھ لو۔ اب پانچ سو کپ چائے اور دو سو سلائیس کا بِل ہو گیا۔ اس کو کس کے حساب میں لکھے گا؟ اس لئے ہم نے اُس کو نکال دیا۔"

"بہت اچھا کیا۔" میں نے ایرانی سے کہا اور پیسے کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے کہا۔ "ایک ڈبیہ کیونڈر کی دو!"

"عجب مغز پھرا ہے اُس کا۔" ایرانی نے میرے پیسے گنتے ہوئے کہا۔ "دو پیسہ کم ہے۔"

"ساری۔" کہہ کر میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اُسے دو پیسے اور دیئے اور کیونڈر کی ڈبیہ لے کر اُس سے پُوچھا۔ "تو آج کل اشتیاق کہاں پر ہے؟"

"جیل میں ہے۔"

"جیل میں؟" میں حیرت سے ایرانی کی طرف دیکھنے لگا۔ "تم نے اُس بے چارے کو جیل بھجوا دیا۔"

"ہم نے کہاں پہونچایا ہے صاحب۔ وہ تو اپنی کرنی سے گیا ہے، شراب کی سمگلنگ کے دھندے میں۔"

"اچھا۔ یہ دھندا بھی اس نے شروع کر دیا تھا۔"

"وہ تو یہ دھندا نہیں کرتا صاحب۔ مگر ہمارا باورچی سنتو اپنے کھالی ٹایم میں یہ دھندا کرتا تھا اور اِدھر اُدھر کی بلڈنگوں میں رات کو باٹلی پہنچاتا تھا۔" ایرانی بولا۔ "پھر ایک رات پولیس نے اُس کے جھونپڑا پر چھاپہ مارا۔ چھ باٹلی پکڑا گیا تو اشتیاق بولا کہ سنتو بے گناہ ہے۔ میں نے یہ چھ بوتل شراب کا اِدھر لاکے رکھا تھا اس واسطے اشتیاق کو تین مہینے کی سجا ہو گئی ہے۔"

"اس نے ایسا کیوں بولا؟"

"وہ بولا۔ ہمارا کیا ہے ہم اکیلا آدمی ہے تین مہینے کی سجا چٹکی بجاتے کاٹ لے گا۔ مگر جب سنتو کی گھر والی اپنے بچے سنتو کو لے کر اس جھونپڑے میں آئے گی تو جھونپڑا کھالی دیکھ کر رو دے گی!"

ایرانی ہوٹل کا مالک اپنے سر پر انگلی رکھ کے بولا "بھیجا پھر گیا ہے اس کا!"

تین ماہ بعد ــــــ

زرینہ کو خیال آیا کہ جیل سے رہا ہوتے ہی اشتیاق ہمارے گھر آئے گا۔ لیکن جب تین ماہ سے اوپر کئی دن گزر گئے اور اشتیاق نہ آیا تو اُسے کچھ مایوسی سی ہوئی، مایوسی مجھے بھی ہوئی۔ پھر میں نے سوچا کہ اشتیاق اگر ہمارے گھر نہیں آئے گا تو ممکن ہے اِدھر اُدھر ایرانی ہوٹل کے باہر ضرور دکھائی دے گا۔ پر اُدھر بھی نہیں۔ سنتو باورچی سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ اُس کے ہاں بھی نہیں آیا۔ پھر ہم دونوں نے سوچا ممکن ہے اشتیاق شرم کے مارے یہ علاقہ ہی چھوڑ گیا ہو یا بمبئی سے کہیں باہر چلا گیا ہو۔ جب دو اڑھائی ماہ اور گزر گئے اور اشتیاق نہ آیا تو ہمارا خیال یہ پکا ہو گیا۔

پھر ایک روز۔ ہم نے یکایک اُسے ایک دعوت میں دیکھا۔ سردار زور آور خاں کے ہاں ہماری دعوت تھی جن کی بیوی نصرت خانم میری بیوی کی خاص سہیلی تھی۔ ہم تو کھانے کے شروع کے دو لقمے کھاتے ہی سمجھ گئے کہ یہ کس کا سٹایل ہے۔ پہلا لقمہ چکھتے ہی میں نے زرینہ کی طرف اور زرینہ نے میری طرف چونک کر دیکھا مگر ہم دونوں چُپ رہے۔ کھانے کے بعد جب دعوت کی تعریفیں ہونے لگیں تو کچن سے خراماں خراماں اشتیاق برآمد ہوئے۔ کالی پتلون کے اُوپر لال بوشرٹ اور لال بُش شرٹ کے اُوپر بھورے رنگ کا ایک میلا ایپرن پہنے ہوئے اور سر جھکا کر کورنش بجالاتے ہوئے شاعروں کے انداز میں داد بٹورنے

لگے ــــ!

نہ میں نہ زرینہ نے اُس وقت انہیں پہچاننا مناسب سمجھا۔ اشتیاق نے بھی اُسوقت ہمارا رویہ سمجھ کر مکمل اجنبیت اختیار کی۔

بعد میں نُصرت نے زرینہ کو الگ لے جا کے بتایا "بہت اچھا لُگ مل گیا ہے مجھے: اشتیاق احمد خاں نام ہے اس کا۔ اپنی طرف کا ہے قاضی خیل کا پشتو بہت اچھی بول لیتا ہے حالانکہ بچپن ہی سے اِدھر رہا ہے پھر کھانا تو غضب کا پکاتا ہے۔ کچن میں بڑی بچت سے کام لیتا ہے۔ جب سے یہ آیا ہے میرے کچن کا خرچہ اڑھائی سو روپے کم ہو گیا ہے۔ پُورے ڈھائی سو روپے۔ سُنتی ہو! میں اس کو صرف ستر دیتی ہوں حالانکہ سو بھی دُوں تو سستا رہے گا۔

زرینہ انجان بن کر بولی "یہ آدمی تو شریف معلوم ہوتا ہے۔

"ارے شریف ایسا شریف!" نُصرت اشتیاق کی تعریف کرتے ہوئے بولیں "میرے بچوں پر تو جان چھڑکتا ہے اور میرے سب سے چھوٹے نجّو کو تو دل و جان سے چاہتا ہے۔ کوئی سگی ماں اُس کی کیا خدمت کرے گی جیسی وہ نجّو کی کرتا ہے۔ ابھی چار دن کی بات ہے نجّو موٹر مانگ رہا تھا۔ میں نے کہا لا دوں گی۔ میں ٹال رہی تھی کیونکہ گھر میں دو کھلونے موٹروں کے پہلے سے پڑے ہیں۔ پُرانے ہو گئے ہیں ذرا تو کیا ہوا۔" نصرت زرینہ کا ہاتھ پکڑ کر خوشی سے بولی۔ یہ موا اشتیاق دس روپے کی موٹر میرے نجّو کے لئے لے آیا تو میں نے غصہ سے جھلا کر کہا "میں تو اس موٹر کے پیسے نہیں دوں گی۔ تو موا بولا "نہ دیجیے بیگم صاحب میں تو اپنے پیسوں کی موٹر لایا ہوں نجّو کے لئے۔ اس پر وہ غصہ سے گرج کر بولے "تو تم سے کس نے کہا تھا نجّو کے لئے موٹر لانے کو؟" تو اشتیاق پہلے تو اُن کی گرج سُن کر سہم گیا۔ پھر

ہوئے سے سر اُٹھا کر بولا "صاحب، میں نجو کا کہنا نہیں ٹال سکتا۔ وہ جو کہیں گے میں مزدور لے آؤں گا۔"

اُس نے ایسے مضبوط لہجہ میں اُن سے بات کی کہ اُن کا سارا غصہ اُتر گیا۔ مُسکراتے ہوئے ایک طرف کو سرک گئے۔ میں بھی کیا بولتی بہن، چُپ ہو کر سروتے سے سپاری کاٹنے لگی۔

زرینہ خاموشی سے مُسکرا مُسکرا کر نصرت کی باتیں سُنتی رہی مگر اُس نے ایک دفعہ بھی نہیں بتایا کہ وہ اشتیاق کو جانتی ہے۔ نہ اگلے ایک سال میں اشتیاق نے ایک بار بھی جتایا کہ وہ ہم لوگوں کو پہلے سے جانتا ہے۔ ہم نے سوچا بے چارہ جہاں لگا ہے لگا رہے اس کی خامیاں جتانے سے کیا فائدہ؟ اور یہاں زور آور خاں صاحب کے ہاں رہ کر اشتیاق بہت ٹھیک ہو چلا تھا بال ماتھے پر نہیں لٹکتے تھے۔ ذہنی طور پر بہت کم غائب رہتا تھا۔ کپڑے صاف سُتھرے پہنتا تھا۔ شعر و شاعری ترک کر دی تھی۔ دن بھر یا تو کچن میں رہتا یا خاں صاحب کے بچوں کی دیکھ بھال کرتا۔ حالانکہ اُن کی دیکھ بھال کے لئے دو آیائیں الگ سے مقرر تھیں مگر بچے جس قدر اشتیاق سے مانوس ہو گئے تھے اتنے گھر کے کسی دُوسرے مُلازم سے نہ تھے۔ میں نے اور زرینہ نے سُکھ کا سانس لیا "چلو۔ یہ اشتیاق نارمل تو ہوا۔"

ایک رات زور کی گھنٹی بجی کوئی تین بجے کا وقت تھا میں نے گھبرا کر دروازہ کھولا باہر سردار زور آور خاں کا ڈرائیور حامد کھڑا تھا۔

"حضور جلدی چلئے۔ بیگم صاحب نے گاڑی بھیجی ہے۔"

"کیا بات ہے حامد؟" میں نے پوچھا۔

"اشتیاق نے زہر کھا لیا ہے!"

"ارے" میرے مُنہ سے نکلا۔

"ہاں صاحب۔ اشتیاق نے زہر کھالیا ہے اور خاں صاحب پونا میں ہیں۔ گھر پر بیگم صاحب کے دو بھائی ہیں مگر اُن کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔ ڈاکٹر مقصود کو ٹیلیفون کیا تھا بیگم صاحب نے مگر وہ بولے یہ پولیس کیس ہے۔ میں نہیں آسکتا۔ اور اشتیاق مر رہا ہے۔"

زرینہ میرے پیچھے کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ لرزتے ہوئے لہجہ میں بولی۔ "تم جلدی سے چلے جاؤ بے چاری نصرت سخت پریشان ہوگی۔"

خان صاحب کے ڈرائنگ روم کے عین مرکز میں فرش پر سر سے پاؤں تک ڈھکی ہوئی ایک لاش رکھی تھی اور نصرت اور اُن کے بھائی بہن اور گھر کے دوسرے ملازم حیرت سے "صم بکم" کھڑے اُسے دیکھ رہے تھے۔

"کیا مر گیا؟" میرے مُنہ سے بے اختیار نکلا۔

"نہیں ابھی تو زندہ ہے!" ایک آیا آہستہ سے سسکتے ہوئے بولی۔

میں نے چادر ہٹا کر نبض دیکھی۔ سینے کے زیر و بم میں زخرے کی گھر گھراہٹ تھی اور نبض ٹوٹ رہی تھی۔ نصرت ایک بھوری شال اوڑھے دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔

"کب اس نے زہر کھایا؟" میں نے نصرت سے پوچھا۔

نصرت کچھ نہیں بولی۔ جیسے اُس نے میرا سوال سُنا تک نہ ہو۔

نصرت کا چھوٹا بھائی بولا۔ "کوئی دو بجے کے قریب میں نے اپنے بستر کے قریب کسی کی آواز سُنی۔ کوئی آہستہ آہستہ سے مجھے جھنجھوڑ کر جگا رہا تھا۔ جب جاگا تو معلوم ہوا اشتیاق ہے۔ وہ باورچی خانہ سے رینگتا رینگتا میرے کمرہ میں پہونچا تھا اور مجھ سے کہہ

رہا تھا:" مجھے بچا لیجئے میں نے زہر کھا لیا ہے۔"

میں نے پوچھا۔" کون سا زہر؟"

"بولا۔ ٹیک ٹو۔"

"ٹِک ٹو کیا؟"

"ٹِک ٹو! ٹِک ٹو۔ اس کی زبان زہر سے موٹی ہو چکی تھی اور آواز میں لکنت تھی۔ وہ کہنا چاہتا تھا ٹیک ٹو ٹینٹی لیکن اس کے مُنہ سے نکلتا تھا صرف ٹِک ٹو۔ پھر وہ میری چارپائی سے لگ کر قے کرنے لگا۔ میں نے مزید داستان سُننا بے کار سمجھ کر فوراً کہا:" اُسے اٹھا کر نیچے گاڑی میں ڈالو۔ ہسپتال لے جائیں گے۔"

"مگر پولیس" نصرت کانپ کر بولی۔

"پولیس کو وہیں سے اطلاع کر دیں گے" میں نے کہا۔ نزدیک کا ہسپتال کونسا ہے۔"

"جانا وتی۔"

"یہاں سے کتنی دُور ہو گا۔؟"

"کوئی چار میل۔"

"جلدی چلو۔"

جس وقت چار آدمیوں نے مل کر اشتیاق کو پہلی منزل سے نیچے اُتارا اس وقت ہلکی ہلکی سی بارش ہو رہی تھی۔ سڑک کے کنارے کنارے روشنی کے قمقمے پانی میں بھیگے ہوئے یُوں سر جھکائے کھڑے تھے جیسے اپنی زرد زرد زندگی پر رو رہے ہوں۔ بھیگی ہوئی سڑک پر کہیں کہیں روشنی کے چھوٹے چھینٹے نظر آتے پھر اندھیرا اُنہیں کھا جاتا پھر تنگ و تاریک گڑھوں کی ماری ہوئی ایک سڑک پر کار یوں لڑکھڑا کر چلنے لگی جیسے ایک عورت اپنی عصمت

لگتا کہ رات کی اوٹ میں اپنے گھر کی طرف بھاگ رہی ہو۔

ایمرجنسی وارڈ میں!

اے فارم بھرو!

بی فارم بھرو!

سی فارم بھرو!

زندگی تم بھی تو رکو!

اشتیاق کا سر بھورے رنگ کے آئیل کلاتھ کے گدوں پر ٹکا ہے۔ اس کی آنکھیں کسی گہرے گڑھے میں جا گری ہیں اور ان پر بادوں کا ٹرک گھوں گھوں کرتا ہوا چل رہا ہے۔

پچھتر روپیہ ایڈوانس دو۔

یہ رسید لو۔

وٹھل۔ مریض کو کمرہ نمبر ۷ میں لے جاؤ اوپر۔ لفٹ سے۔ میں ابھی ڈاکٹر کو ٹھاری کو ٹیلی فون کرتا ہوں۔

باہر سے کوئی ٹرک گزرتا ہے۔

گھوں گھوں

اشتیاق کا سینہ ہونکتا ہے۔

ہوں ہوں۔

آئیل کلاتھ کا بھورا بستر اپنے پایوں میں لگی ہوئی ربڑ کی چرخیوں کے ذریعہ لفٹ کی جانب حرکت کرنے لگتا ہے۔ لفٹ اوپر کی منزل پر جاکے رُک جاتی ہے۔ بستر برآمدے میں سے گزر رہا ہے۔ کمرہ نمبر سات کے اندر جاتا ہے۔ ایک ڈاکٹر اور دو نرسیں اندر آئیں۔ سات نمبر کا

پردہ گرا دیا جاتا ہے۔ ایک ڈاکٹر اور دو نرسیں اندر آتی ہیں اور ہم باہر بینچ پر بیٹھ جاتے ہیں۔ لمبے کوریڈور میں بے آواز نرسیں خاموشی سے گھوم رہی ہیں۔ اردلی نیند کی غنودگی سے بیزار ٹہل رہے ہیں۔ کہیں کوئی ہولے ہولے کراہتا ہے کو دھیرے دھیرے سسکتا ہے۔

"اشتیاق نے زہر کیوں کھایا؟" میں پوچھتا ہوں۔

"غبن کیا ہو گا۔" نصرت کا چھوٹا بھائی اندازہ لگا کے کہتا ہے۔

"بہن نے ہوتے ہوئے گھر کا سارا خرچہ اشتیاق کے سپرد کر دیا تھا۔ ہر وقت چار پانچ سو روپے اشتیاق کی جیب میں رہتے تھے، کل بہن نے اشتیاق سے حساب دینے کو کہا تھا۔ آج اُس نے زہر کھا لیا۔ میرا خیال ہے کہ ...."

"تمہارا خیال غلط ہے۔" نصرت کا دوسرا بھائی بولا۔ "اشتیاق میں دس بُرائیاں ہوں مگر وہ چور نہیں ہے۔ آج تک اس نے ایک دھیلے کی چوری نہیں کی۔ میرے خیال میں پچھلے ہفتے جو مُراد آباد سے اُسے اطلاع ملی تھی کہ اس کے آبائی مکان والے مقدمہ کا فیصلہ اس کے خلاف ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس کا غم اسے بہت ہوا ہے۔"

"اجی نہیں۔" بڈھا حامد اپنی گھنی بھنووں پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ "اشتیاق کو مکان دوکان روپے پیسے سے کبھی محبت نہیں رہی۔ یہ سب اس لونڈیا کا چکر ہے۔ گلشن کا!"

"گلشن! میرے کان کھڑے ہوئے۔ گلشن کون ہے؟ میرے ذہن میں بلی کودنے لگی ....

"ایک نئی آیا رکھی ہے صاحب نے۔ بڑی بدصورت لونڈیا ہے، مگر سولہ سترہ برس کی ہے۔ بھاگ بھاگ کر کام کرتی ہے۔ اس کا نام گلشن ہے۔ اور صاحب ہم نے سُنا ہے کہ اشتیاق کی پہلی بیوی کا نام بھی گلشن تھا۔"

"ارے!" میں چونک گیا۔

"جی ہاں۔ اسی لونڈیا کے چکر میں زہر کھالیا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"پہلے تو صاحب سے کہتے رہے کہ اس لڑکی کو نکال دو۔ یہ کام ٹھیک سے نہیں کرتی ہے پھر ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ میں اس وجہ سے اُسے نکلوانا چاہتا ہوں کہ اس کا نام گلشن ہے۔ میں نے کہا بھلے مانس۔ اس کا نام گلشن ہے تو کیا ہوا کام تو ٹھیک کرتی ہے۔ مگر اشتیاق نہیں مانے۔ برابر اس کی شکایت کرتے رہے مگر جب صاحب کسی طرح نہیں مانے تو صاحب کو تو معلوم نہیں کب انہوں نے ہار مانی اور کب اشتیاق میاں نے رویہ بدل دیا۔ اب یہ اس لڑکی پر مہربان ہونے لگے۔ دوسرے نوکر تو چائے پیتے تھے یہ اس کو کافی پلانے لگے جو صرف صاحب اور بیگم صاحب پیتی ہیں۔ پھر ایک دن گلشن کو جو پتہ چلا کہ اس کو کافی ملتی ہے جب کہ دوسرے نوکروں کو صرف چائے ملتی ہے تو وہ ایک دم بدک گئی اور اس نے اس دن سے کافی پینے سے انکار کر دیا۔ ایک دن اس نے اشتیاق کو بازار سے دیسی صابن لانے کو کہا تھا تو یہ اس کے لئے انگریزی صابن لے آئے۔ اُس نے کھوپرے کا تیل مانگا تو یہ گلزار ہیر آئل نمبر دن اُٹھا لائے۔ کل گلشن کی ماں کا خط آیا جو بیگم صاحب نے پڑھ کر سنایا۔ اب اشتیاق کی تو عادت تھی دروازہ پر کھڑے چوروں کی طرح سنتے رہتے تھے۔ گلشن کی ماں نے لکھا تھا کہ اس کی ماں نے گلشن کی شادی کی بات چیت پکی کر لی ہے لڑکا کسی سیمنٹ کمپنی میں دربار ہے۔ یہ خالی باورچی تھے وہ انہیں کیا منہ لگاتی۔ بس جب سے یہ سنا کچن ہی میں بیٹھے ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرتے تھے اور مجھ سے کہتے تھے اب جینا بے کار ہے۔ میں نے پوچھا "کیا ہوا؟" بولے کچھ نہیں! اور پھر اپنے سینے پر ہاتھ مار کر بولے۔ "مگر اب جینا بے کار ہے۔" یہ آج دوپہر کی بات ہے۔۔۔۔ رات کو انہوں نے زہر کھالیا۔۔۔۔" حامد اتنا کہہ کر چپ ہو گئے۔

میں نے چند لمحوں کے سکوت کے بعد پوچھا "مگر زہر کھانے سے پہلے اُس کمبخت نے لڑکی سے کوئی بات نہیں کی ؟"

"بالکل نہیں صاحب" حامد خفا ہو کے بولے "بالکل یک طرفہ عشق تھا۔ دس دن تو ہوئے ہیں گلشن کو آئے ہوئے۔ ان دس دنوں میں انہوں نے اس لڑکی سے نفرت بھی کی۔ دوستی کی ابتدا بھی کی محبت بھی کی پھر آپ ہی آپ مر بھی گئے۔ سب کچھ دس دنوں میں کر لیا۔ لڑکی کو تو کچھ خبر بھی نہیں ہے صاحب۔ وہ تو ایسی بدصورت ہے اور ایسی بھیجے کی خالی ہے کہ اُسے تو گمان تک نہیں گزر سکتا کہ کوئی اُس سے عشق کر سکتا ہے"

حامد چونکہ بڈھے تھے اور زندگی کے اس دَور میں سے گزر رہے تھے جب کوئی کسی سے محبت نہیں کر سکتا اس لئے داستان سناتے وقت اُن کے لہجہ کی شدید تلخی جس طرح اُن کی مجبوری کی غمازی کر رہی تھی اُس سے مجھے بڑا لطف آیا۔

کوئی ساڑھے چھ بجے کے قریب ڈاکٹر کوٹھاری کمرہ نمبر سات سے برآمد ہوئے اور مجھے دیکھ کر بولے "ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا مگر اگلے چوبیس گھنٹے اس پر بہت نازک ہیں۔ میں نے اس کا معدہ صاف کر دیا ہے۔ گلوکوز کے سیلائین پر رکھ دیا ہے کھانے کو دوا دے دی ہے۔ انجکشن دے دیئے ہیں کچھ لکھ دیئے ہیں"

"شکریہ ڈاکٹر صاحب۔ مگر کیا مریض اس وقت ہوش میں ہے"

"ہوش میں تو ہے مگر ابھی بہت کمزور ہے۔ ابھی زیادہ لوگ اس سے نہ ملیں تو بہتر ہے" ڈاکٹر نے میری طرف اشارہ کر کے کہا "صرف آپ اس سے چند منٹ کے لئے مل لیں۔ میں نے تھانے ٹیلی فون کر دیا ہے۔ کسی وقت بھی پولیس انسپکٹر اس کا بیان لینے کے لئے آسکتا ہے۔ کیونکہ مریض کی حالت بہت نازک ہے . . . ."

اتنا کہہ کر ڈاکٹر کوٹھاری چلے گئے تو نصرت کا چھوٹا بھائی برافروختہ ہو کے بولا ’’خاں صاحب گھر پر نہیں ہیں اور یہاں پولیس کے سامنے نہ جانے کس کس کے بیان ہوں گے۔ اُلّو کے پٹھے کو اتنی عقل نہیں آئی کہ اگر مرنا ہی تھا تو سمندر میں ڈوب کے ہی مر جاتا۔ کسی گاڑی کے نیچے آکر ہی مر جاتا۔ کہیں پر مرتا مگر اس گھر سے دُور رہ کر ہی مرتا اور یوں ہم سب کو پریشان کر کے تو زہر نہ کھاتا۔۔۔۔‘‘

’’بجا فرمایا آپ نے۔‘‘ میں نے کہا ’’مرنے والوں کو ہمیشہ اپنے بعد زندہ رہنے والوں کی سہولیت کا خیال کر کے مرنا چاہیئے اس سلسلے میں اگر آپ ایک رہنمائے خودکشی شائع کریں تو بہتوں کا بھلا ہوگا۔‘‘

اتنا کہہ کر میں کمرہ نمبر سات میں داخل ہو گیا۔

اتفاق سے اُس وقت کمرہ میں کوئی نہیں تھا۔ نرس کوئی دوا لانے کے لئے گئی تھی۔ اشتیاق گہرے تکیوں میں سر ٹکائے لیٹا تھا۔ اس کے دائیں بازو کی رگ میں سیلائین جا رہا تھا۔ دوسرا بازو اس کے سینے پر تھا، اس کی آنکھیں بند تھیں، اس کے سیاہ چہرے کے پیچھے سفید تکیوں سے پرے کھڑکی کی پلکوں پر بارش کے قطرے لرز رہے تھے۔ اور کانچ کی سطح پہ روشنی اور سائے امید و بیم کی کش مکش کی طرح لرزاں تھے۔

’’اشتیاق!‘‘ میں نے اُس کے بستر کے قریب جا کر سرگوشی میں کہا ’’اشتیاق سنو!‘‘

میں نے پھر ذرا اُونچی سرگوشی میں کہا ’’کان کھول کے سنو میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے نرس آ رہی ہے۔‘‘

اشتیاق نے آنکھیں کھولیں۔ اور جب میں نے دیکھا کہ اُس نے مجھے پہچان لیا ہے۔ تو میں نے اُس کے قریب جُھک کر کہا ’’کسی وقت بھی پولیس انسپکٹر تمہارے پاس بیان قلمبند

کرنے کے لئے آجائے گا۔ اُس سے صرف یہ کہنا ہو گا کہ تمہارے پیٹ میں درد تھا اور تم امرت دھارا لے کر سو گئے تھے کچن میں۔ اتفاق سے کچن میں تمہارے سرہانے (جک ۲۰) کی شیشی بھی پڑی تھی وہ بھی اتنی ہی بڑی ہوتی ہے جتنی امرت دھارا کی۔ اس لئے رات کو جب تمہارے پیٹ کا درد بڑھا تو تم نے غلطی سے امرت دھارا کی جگہ (جک ۲۰) غلطی سے پی لی۔ بس اور کچھ مت کہنا۔ سمجھتے ہو؟"

اشتیاق نے میری طرف دیکھ کر خاموشی سے سر ہلا دیا۔

آنکھوں کی پتلیاں نیم ساکت، ہونٹ اندر کو بھینچے ہوئے، رخساروں کے گڈھے گہری اور اتھاہ تاریکی میں کھوئے ہوئے، سینہ کھلا اور اُجاڑ خشک بالوں سے ڈھکا ہوا کسی ویران جزیرہ کی مانند اور دُبلی پتلی پسلیاں کسی شکستہ معبد کی سیڑھیوں کی طرح زندگی کے سوکھے تالاب کی طرف جاتی ہوئیں.....

"اشتیاق! اشتیاق۔ تم نے ایسا کیوں کیا؟" میں نے اُس کے سر پر جھک کر گہری شدت سے پُوچھا۔

اس کا چہرہ دیر تک بالکل ساکت رہا جیسے اُس نے میرا سوال نہ سُنا ہو۔ پھر اس کا ہاتھ اس کے سینے پر سرکنے لگا۔ دھیرے دھیرے وہ اپنا سینہ اپنی انگلیوں سے سہلاتے ہوئے ہوا کی سی سرگوشی میں بولا۔

"سینہ خالی ہے۔"

سینہ خالی ہے۔ کتنی صدیوں سے انسان کا سینہ خالی ہے اور انسان کے اس خالی سینے کو رام نہ بھر سکے اور مسیح نہ بھر سکے اور حسینؓ نہ بھر سکے تو تم کیا بھر سکو گے احمق باورچی! ارے اس سینہ کے اندر خوفناک گڈھے ہیں، اور گہری کھائیاں ہیں، کیسے کیسے بسیط خلا ہیں

جن کے اندر تم کہاں کہاں سے کوڑا کباڑ لا کے ڈالتے رہے ہو۔ تاکہ کسی طرح سے یہ خلا بھر جائے۔ پہلے تم نے اُس ننھے نواب کو اس میں پھینکا۔ پھر ایک بلی کو دُم سے باندھ کر اس میں لٹکا دیا۔ پھر سینکڑوں کپ چائے کے تم نے اس میں انڈیل دیئے اور ڈبل روٹیاں کاٹ کاٹ کر اس کے اندر پھینکتے رہے۔ تم میری ٹوتھ پیسٹ بناتے رہے اور خود بے گھر رہ کر دوسروں کے لئے گھر ڈھونڈتے رہے اور اپنے بچوں کی مایوسی میں دوسروں کے بچوں سے محبت کرتے رہے مگر تم گلشن کو کبھی بھول نہ سکے۔ اور کسی طرح یہ خلا پُر نہ ہو سکا۔ گلشن گلشن تم کانٹے چُنتے رہے اور بے قرار اور مضطرب ہو کر ایک پیشے سے دوسرے پیشے کی چکی میں گھُستے رہے تاکہ کسی طرح تم اس خلا کو بھر سکو جسے صرف ایک عورت کی محبت بھر سکتی ہے..... پگلے —!

نرس اندر آ گئی۔

میں نے ایک لمحہ کے لئے اشتیاق کے خاموش سُتے ہوئے سیاہ بدہیئت چہرے کو دیکھا۔ تکیوں کے پیچھے بند کھڑکی کی پلکوں سے چند قطرے ہوا سے لرز کر ٹوٹے اور کانچ کے رخساروں پر بہتے ہوئے چلے گئے..... میں کمرہ سے باہر نکل آیا۔

ربڑ کی عورت

حسن کی تیسری بیوی بستر مرگ پر تھی۔ شکیلا نے حسرت بھری نگاہوں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اپنی زندگی کی آخری سانسوں کو مجتمع کرتے ہوئے کہا۔

"میں تو اب جا رہی ہوں مگر فاروق کا خیال رکھنا۔ گیارہ سال کا بچہ ہے۔ اپنی ماں کے لئے روئے گا۔ تمہارے سوا اور کون ہے اس کا اس دنیا میں۔ گرمی اس کے مزاج میں بہت ہے۔ اسے ہر روز دہی دیتے رہنا۔ دہی سے اس کی صحت ٹھیک رہتی ہے۔ جما ٹھیک سے دودھ نہیں لا رہا ہے۔ میرے فاروق کے لئے اپنے سامنے دودھ لیا کرنا۔ میرے خیال میں تو محلہ گوجر کا دودھ لگوا لو۔ اگیا بھاجی والی کے صرف سوا سات روپے باقی ہیں بہت جھوٹی ہے مکار، کہیں زیادہ رقم نہ تم سے اینٹھ لے۔ باقی سب کا حساب میں کر کے جا رہی ہوں۔ اماں کو تار دے دینا مگر ماموں کو خبر نہ کرنا۔ میں نے قسم کھائی تھی مرتے مرتے ماموں کا منہ نہ دیکھوں گی۔ میں تو جا رہی

ہوں اب پر فاروق کے کپڑے درزی کے ہاں سلنے کو دے رکھے ہیں۔ پندرہ روپے وہ مجھ سے ایڈوانس لے چکا ہے۔ دھیان رکھنا۔ بل میں سے کاٹ لینا اور کچن کے نل کی ٹونٹی ٹوٹ گئی ہے۔ چائے کا نیا سیٹ بھی آئے گا گھر میں، فاروق کو پرانے پیالوں سے چڑ ہے۔ میں تو اب جا رہی ہوں پر تم اب چوتھی شادی مت کرنا۔ رحیلہ، نو سال کی میری بچی، کو وہ سوت مار ڈالے گی۔ پانچ چھ سال میں یہ رحیلہ جوان ہو جائے گی۔ اب اپنی شادی کی نہیں اس کی شادی کی فکر کرنا۔ چابیوں کا گچھا پانداں میں رکھا ہے۔ تمہاری پاس بک اور چیک بک میری وارڈروب کے اندر بائیں طرف شیلف میں ٹنگے ہوئے بھورے رنگ کے اوور کوٹ کی اندر کی جیب میں ہے میری معصوم رحیلہ کی شادی کہیں فیروز کی ماں کے کہنے میں آ کر اظہر سے نہ کر دینا۔ کب سے وہ یہ رشتہ مانگ رہی ہے پر وہ کٹنی مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی ادھر کا رخ کر دگے تو محشر میں تمہارا دامن پکڑوں گی۔ میں تو اب جا رہی ہوں مگر وہ...... منسا رام بزاز کو میں نے اپنی کالی بنارسی ساڑی کے لئے بارڈر منگانے کو کہا تھا اور اسے....."

شکیلا آگے کچھ نہ کہہ پائی، اس کا دم ٹوٹ گیا، حلق کا منکا ڈھلک گیا۔ آخری سانس بھی نکل گئی۔ گھر میں سب لوگ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔

حسن ایک جرمن فرم میں ساڑھے پانچ ہزار روپے تنخواہ پاتا تھا۔ اس کا شمار اپنی فرم کے بہترین آفیسروں میں ہوتا تھا۔ وہ بے حد ذہین اور مستعد کارکن تھا۔ اسے اپنے کام سے لگن تھی۔ طبیعت خاموشی پسند تھی اور لڑائی جھگڑے سے وہ بہت گھبراتا تھا مگر اپنی گھریلو زندگی سے وہ ہمیشہ بیزار رہا۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ پہلی بیوی جو اسے ملی بے حد جھگڑالو تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ ہر روز اپنے شوہر سے کسی نہ کسی بات پر جھگڑا کر بیٹھتی۔ تھوڑے سے جھگڑے کو حسن بھی برداشت کر سکتا تھا۔ مگر وہ تو جھگڑے کو لٹکانے میں ماہر تھی۔ دو سال میں ہی اس

نے حسن کی جان مشکل میں کر دی اور وہ تنگ آ کر خودکشی کی سوچنے لگا۔ وہ تو حسن کی خوش قسمتی کہیئے کہ اس کے خودکشی کرنے سے پہلے اس کی بیوی ہی ملک عدم کو سدھار گئی۔

پہلی بیوی ایک دم گنوار لٹھ، ان پڑھ تھی اس لیے حسن نے سوچا: جھگڑا لازمی تھا، اب وہ کسی پڑھی لکھی، مہذب، سلیقے والی عورت کو بیاہ کر لائے گا، اپنے ماں باپ پر قطعی بھروسہ نہیں کرے گا۔ یہ محبت کی شادی ہوگی، بہت دیکھ بھال کے خوش قسمتی سے اسے بہت جلد کاملہ مل گئی۔ وہ ایک متمول، متمدن گھرانے کی لڑکی تھی۔ بے حد حسین، یورپی تعلیم سے آراستہ، آداب محفل سے واقف اور دل و جان سے حسن پر فریفتہ۔ بہت جلد شادی ہو گئی۔ شادی کے بعد چند ماہ بے حد آرام اور خوشی سے گزرے۔ ایک بچہ بھی ہوا۔ بچہ ہونے کے بعد ہی جیسے کاملہ اپنی تمام یورپی تعلیم اور مغربی آداب محفل بھول کر پرانے ٹائپ کی گرہستن بن گئی اور بات بے بات اپنے شوہر سے چیخ چیخ کرنے لگی۔ اس نے بجنا چھوڑ دیا میک اپ بہت کم کر دیا۔ کبھی حسن کی پسند کے کپڑے نہیں پہنتی تھی جس رنگ کا کپڑا حسن کو پسند ہوتا اسی سے کاملہ کو چڑ ہو جاتی۔ اس کے بال، جو تازہ ترین فیشن کے مطابق کٹے اور سجے سنورے ہوتے تھے۔ اب نیچے کھٹے رہنے لگے۔ بات بات پر وہ نوکروں پر چیخ پڑتی۔ اک ذرا سی بات کو لے کر گھنٹوں رونے لگتی۔ حسن کے کسی ذرا سے مشورے پر جھلا اٹھتی، اپنے آپ کو کوستی، اسے صلواتیں سناتی۔ گھنٹوں بکواس کرتی۔ لگاتار کوسنے دیتے ہوئے بات چیت کو اتنا لمبا کھینچتی کہ اگر کبھی حسن عاجز آ کر اس کی باتیں سنتا سنتا ہم سب سے اُٹھ کر چلا جاتا تو بھی لگاتار سنائے دیتی جاتی اس بات کی پرواہ کئے بغیر کہ حسن اس کے سامنے بیٹھا بھی ہے کہ نہیں پانچ سال میں ہی حسن اس سے اس قدر عاجز آ گیا کہ اس نے ہاتھ جوڑ کر اور پورا مہر دے کر بڑی مشکل سے کاملہ سے طلاق لے لی۔ اس دوران میں کاملہ سے ایک لڑکی بھی ہو چکی تھی۔ میمونہ کاملہ نے اس کا خرچ بھی بندھوا لیا اور میمونہ کو لے کر ہمیشہ کے لئے حسن کا گھر چھوڑ کر چلی گئی۔

حسن نے کچھ عرصے تک سکون کا سانس لیا، مگر آخر نوجوان آدمی تھا، کب تک شادی کے بغیر رہتا، مگر اب کے...... حسن نے سوچا... اب کے..... تیسری بار میں ایسی غلطی نہیں کروں گا اب کے چاہے لٹھ ہو یا گنوار؟ پڑھی لکھی، مہذب ہو کہ غیر مہذب؟ اعلیٰ خاندان کی ہو یا گھٹیا خاندان کی۔ یہ سارے جھگڑے میں نے دیکھے ہیں کہ عورت کی حد سے بڑھی ہوئی حسن گفت گو سے شروع ہوتے ہیں۔ اب کے میں ایسی لڑکی تلاش کروں گا جو بے حد کم سخن ہو۔ بے ضرورت ایک لفظ نہ بولے، اپنے کام سے کام رکھے۔ اپنی گھرداری اور بچوں میں مگن رہے! نہ سوسائٹی میں گھومنے کی عادی ہو۔ نہ فیشن کی دلدادہ، نہ اس کے دفتر کے کام کے سلسلے میں اپنے احمقانہ مشورے دیا کرے۔ میں نوجوان ہوں، اعلیٰ گریڈ کا افسر ہوں۔ معقول تنخواہ پاتا ہوں، پہلے ہی وہ کسی غریب خاندان سے کیوں نہ تعلق رکھتی ہو۔ میری پہلی شرط، اور آخری شرط بھی، یہ ہے کہ وہ زیادہ گفت گو کی شائق نہ ہو، باقی سب سنبھال لوں گا۔

یہ فیصلہ کر کے وہ اپنی تلاش میں لگ گیا، اپنے دوستوں سے، رشتہ داروں سے بھی کہا اس نے ہر اس آدمی پر اپنا عندیہ بیان کیا جو اس کی تیسری شادی میں دل چسپی رکھتا تھا۔ یہ تلاش لیار قرعۂ فال شکیلا کے نام پڑا جس کی کم سخنی اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ اپنی سہیلیوں میں بھی وہ "بدھو" اور "چپو" کے نام سے مشہور تھی۔ یہ سن کر حسن کو ایک حد تک اطمینان ہوا۔ مگر وہ دودھ کا جلا ہوا تھا۔ اب تو وہ چھاچھ بھی پھونک کر پئے گا۔ اس نے کہہ سن کر شکیلا کے والدین کو جو بے حد قدامت پرست تھے، لڑکی کو اسے دکھانے اور بات چیت کرنے پر راضی کر لیا۔

دو چار ملاقاتوں میں حسن کو اطمینان ہو گیا۔ شکیلا نہ صرف کم سخن بلکہ بے حد غبی بھی تھی شکل و صورت بھی واجبی تھی۔ اگر حسن پہلے دو شادیاں نہ کر چکا ہوتا تو شکیلا سے ملتے ہی پہلی ملاقات کے بعد انکار کر دیتا۔ مگر وہ تو ایسے تلخ تجربوں میں سے گزر چکا تھا کہ اب شکیلا کے بھی

مصائب اسے شکیلا کے محاسن نظر آرہے تھے۔ اچھی طرح سے اطمینان کرنے کے بعد حسن نے ہاں کردی اور اس کی تیسری شادی بھی ہوگئی۔ اس کی شادی میں ہر بڑی بوڑھی بڑی بیزاری سے سر ہلا کے کہتی تھی: "کیسی ہے یہ دلہن! بولتی ہی نہیں۔ جانے کیسے یہ حسن کا گھر سنبھالے گی!" یہ فقرہ سن کر اداس ہونے کے بجائے حسن خوشی سے کھل اُٹھا۔

ایک سال گزر گیا۔ شکیلا کے ہاں فاروق ہوا پھر بھی شکیلا کم سخن ہی رہی۔ یہ حسن کے لئے بڑے اضطراب کا زمانہ تھا۔ اسے کاملہ کا تلخ تجربہ تھا۔ وہ گھنٹوں بڑی ہوشیاری سے شکیلا پر نگاہ رکھتا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ کہیں شکیلا میں بھی زیادہ باتیں کرنے کے جراثیم تو نہیں اُبھر رہے ہیں۔ مگر شکیلا بدستور ٹھس کی ٹھس رہی اور حسن نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔

دو سال بعد رحیلہ نے جنم لیا، اور جب رحیلہ ڈیڑھ سال کی ہوگئی اور اس نے بولنا شروع کیا تو اس زمانے میں شکیلا نے بھی بولنا شروع کر لیا، یک لخت ایسے لگا جیسے بیٹی کو زبان ملتے ہی ماں کو زبان مل گئی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا رحیلہ اور شکیلا دونوں بولنے لگیں۔ اور بول بول کر انہوں نے حسن کا ناطقہ بند کر دیا۔ اب وہ جائے تو کہاں جائے۔؟

اس نے اپنی بدنصیبی پر ہتھیار ڈال دیا اور اپنی قسمت منظور کرلی۔

گھر میں ہر وقت وہ بُجھا بُجھا سا رہنے لگا۔ اس سے پہلے وہ ہر جھگڑے کو اپنی، سنجیدہ گفتگو، ٹھنڈی، پرمغز بات چیت سے نپٹانے کی کوشش کرتا تھا۔ لڑائی جھگڑے کا کسی حد تک جواب بھی دیتا تھا، کبھی اُسے غصہ بھی آجاتا اور وہ ترکی بترکی جواب دیتے ہوئے خود بھی چیخنے چلانے لگتا تھا، مگر اب جیسے اس کی ہمت جواب دے گئی اور اس نے ہتھیار ڈال دیئے اور طے کر لیا یہ گھر یونہی چلے گا اور اسی طرح چلے گا، اب تقدیر سے لڑنا فضول ہے۔

گھنٹوں وہ گھر میں دم سادھے پڑا رہتا۔ شکیلا اس کے لڑتی جھگڑتی، شکایت کرتی،

طعنے دیتی۔ وہ سنی اَن سنی کر دیتا، جان بوجھ کے بہرہ بن جاتا، جہاں تک ہو سکے خاموش رہتا۔ اگر بات کرنے پر مجبور ہی کر دیا جاتا تو شکیلا کی ہر بات میں ہاں میں ہاں ملا کر بات کو سلجھا دیتا۔ یعنی اور بگاڑ دیتا۔ اس سے شکیلا کے حوصلے اور بلند ہو گئے۔ اپنے شوہر کو دبا کر اس نے آس پاس کے ہمسایوں سے جھگڑنا شروع کیا۔ روز کوئی نہ کوئی فساد کھڑا رہتا تھا۔ حسن سب کچھ دیکھتا تھا سنتا تھا مگر اب وہ بولتا نہیں تھا۔ اصلاح کرنے کی کوشش نہیں کرتا تھا؟ اب وہ تقدیر پر شاکر تھا۔

اس طرح شادی کے تیرہ سال گزر گئے۔ شکیلا کی صحت بہت اچھی تھی۔ ان تیرہ سالوں میں اسے بخار تو کیا ایک بار زکام تک نہ ہوا تھا۔ ادھر حسن بھی تندرست بدن کا صحت مند مرد تھا۔ بظاہر اس بات کی کوئی امید نہیں تھی کہ دونوں میں سے کوئی بھی جلد مر جائے گا اور دوسرے کی گلو خلاصی کر جائے گا۔ مگر کرنا خدا کا کیا ہوا کہ تیرہ سال بعد اچانک شکیلہ بیمار پڑی اور اکیس دن بیمار رہنے کے بعد اس دارِ فانی سے کوچ کر گئی۔ یکایک بالکل غیر متوقع طور پر حسن اپنی عمر کے چھیالیسویں سال میں پھر آزاد ہو گیا۔ وہ گھر کے شور و غضب سے اس قدر اُکتا چکا تھا کہ اس نے چوتھی بار شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ فاروق اور رحیلہ کو ان کی دادی دادا کے پاس بھیج دیا اور خود اپنے گھر میں اکیلا، آزاد، امن چین کی زندگی بسر کرنے لگا۔

مگر آخر وہ انسان تھا، اس کے سارے جذبات و حساسات انسانوں کے سے تھے۔ عورت کے بغیر وہ کب تک رہتا! سماج میں وہ ایسی اعلیٰ حیثیت کا مالک تھا کہ ایک اشارے پر اس کے لئے ایک درجن رشتے حاضر تھے، مگر شادی کے نام سے وہ اب کانوں پر ہاتھ رکھتا تھا۔ شادی تو اب وہ کبھی نہیں کرے گا۔ عارضی دوستوں کی بھی کمی نہ تھی۔ ان سے اس کے جنسی جذبے کی تسکین بھی ہو جاتی تھی اور وہ آزاد کا آزاد بھی رہ سکتا تھا۔

وہ تو سب ٹھیک تھا مگر یہ گھر اب اسے کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔ شروع کے چند ماہ بلکہ پورا سال ایک عجیب خوش گوار خاموشی سے گزرا۔ پھر یہی گھر بھائیں بھائیں کرنے لگا۔ ایک عورت کے وجود کے لئے پکارنے لگا۔ دھیرے دھیرے اس کے دل میں تصویریں اُبھرنے لگیں۔ اس کی بیوی ڈرائنگ روم کے دیوان پر کاسنی رنگ کے بروکیڈ کا جھمجھاتا غرارہ پہنے ایک تپائی پر قریب میں پاندان رکھے بیٹھی ہے اور اسے دفتر سے آتا دیکھ کر چپکے سے مسکرا دیتی ہے۔ وہ قریب آکر اسے چوم لیتا ہے۔ وہ مسکرا کر اسے پان پیش کرتی ہے۔ کھانے پر اس کی میز کے سامنے موجود ہے۔ ہاتھ بڑھا کر سالن دیتی ہے۔ منہ سے کچھ نہیں کہتی مگر نگاہوں سے کہتی ہے: ذرا یہ سالن تو چکھو، میں نے خود پکایا ہے۔ وہ کھانا کھا کے بیڈ روم کی آرام کرسی پر بیٹھا ہے۔ منہ میں سگار ہے۔ وہ کچھ نہیں کہتی۔ قریب آکر بڑی محبت سے اس کی آرام کرسی کی ہتھی پر بیٹھ جاتی ہے اور اس کا سگار سُلگا دیتی ہے۔ پھر لچکتی مٹکتی سنگار میز پر چلی جاتی ہے اور اپنے ہونٹوں کی سرخی تازہ کرنے لگتی ہے۔ کتنی ہی خوبصورت مثالی زندگی کی یہ تصویریں ہیں۔ مگر ایک بات ان تمام تصویروں میں مشترک تھی۔ یہ تصویریں بولتی نہیں تھیں۔ صرف نگاہ کے اشارے گردن کے خم اور ہونٹوں کے تبسم سے گفتگو کرتی تھیں اور جب وہ یہاں تک سوچتا تو ٹھنڈی آہ بھر کے رہ جاتا۔ ایسی عورت کہاں ملے گی بھلا؟

دن بدن اس کی زندگی کا سونا پن اور اکیلا پن بڑھتا گیا، عاجز آکر وہ عنقریب چوتھی شادی کا فیصلہ کرنے ہی والا تھا کہ اسے ایک ترکیب سوجھ گئی۔ اور اس ترکیب کے ذہن میں آتے ہی وہ اچھل پڑا۔ ایسی لاجواب، نادر ترکیب آج تک کسی مرد کے ذہن میں نہ آئی ہوگی۔ کئی دن تک وہ اس تجویز کے حسن و قبح پر غور کرتا رہا، خاکے اور نقشے بناتا رہا! آخر مصمم ارادہ کر کے اِدھر اُدھر تلاش کرنے کے بعد ایک فیکٹری کے مینجر کے پاس اپنے ایک دوست کا سفارشی خط

لے کر پہنچا۔

منیجر نے اپنے دوست کا سفارشی خط پڑھا، اپنی کہنیاں میز پر ٹکا کر بڑی خندہ پیشانی سے اس سے مخاطب ہوا۔

"فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"مجھے ایک عورت چاہیئے۔"

منیجر حیرت زدہ رہ گیا۔ بولا: "مگر..... ہماری فرم کا تو کوئی میرج بیورو نہیں ہے، ہم تو محض گڑیاں بناتے ہیں۔"

"مجھے بھی ایک گڑیا چاہیئے" حسن نے بالکل سنجیدگی سے کہا "ربڑ کی عورت۔"

"ربڑ کی عورت؟"

منیجر کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ چند منٹ تک وہ خاموشی سے حسن کو گھورتا رہا۔ آخر بولا: "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں مطلق نہیں سمجھا۔"

حسن نے کہا: "مجھے چند منٹ دیجئے، میں آپ کو سمجھاتا ہوں کہ مجھے کس طرح کی ربڑ کی عورت چاہیئے۔"

اتنا کہہ کر حسن نے جیب سے کچھ خاکے اور نقشے نکالے اور انہیں میز پر بچھا کر منیجر کو سمجھانے لگا۔

چھ ماہ کی محنتِ شاقہ، قطع و برید اور مختلف تجربوں کے بعد ربڑ کی عورت تیار ہوئی بالکل ویسی جیسی حسن چاہتا تھا۔ یہ عورت بول نہیں سکتی تھی، چل نہیں سکتی تھی، سوچ نہیں سکتی تھی مگر تاپا پوری عورت تھی۔ ہر عضو سانچے میں ڈھلا ہوا، عورت کے نادر حسن نازکی اور جمال کا مکمل ترین نمونہ، قد پانچ فٹ چار انچ۔ بیس ہزار روپے میں بن کر تیار ہوئی تھی۔ اندر کا

ڈھانچہ بید کی لکڑی کا تھا مگر اوپر کی فٹنگ فوم ربڑ سے کی گئی تھی۔ بازوؤں ٹانگوں اور گردن کے جوڑ میں سٹین لیس سٹیل کے اسپرنگ لگائے گئے تھے۔ جلد ہلکے گلابی رنگ کے ربڑ کی تھی۔ کالے بالوں کی وگ کمر سے نیچے تک آئی تھی۔ حسن نے جب اس تیار شدہ ربڑ کی عورت کو نئے فیشن کی ملبوس بکنی میں کھڑی مینجر کے کمرے میں دیکھا تو جی جان سے اس پر عاشق ہو گیا، کیونکہ کمر کولہے اور سینے کا تناسب وہی تھا جو مس یونیورس کے مقابلے میں اسٹینڈرڈ مانا جاتا ہے۔ اس ربڑ کی عورت کی جلد کسی بھی خوبصورت سے خوبصورت عورت کی جلد کی طرح نرم اور بیداغ تھی۔ نرم اور ملائم چکنی اور صاف، نکھری نکھری گلابی رنگت آنکھیں بڑی بڑی اور روشن، کمر پتلی، سینہ ابھرا ہوا، گردن لانبی۔ دائیں گال پر ایک چھوٹا سا تل۔ ہر طرح نک سک سے درست اس ربڑ کی عورت میں وہ سب کچھ موجود تھا جو مختلف جگہوں پر، مختلف عورتوں میں کہیں کہیں ملتا ہے۔ مگر ایک جگہ کسی عورت میں نہیں ملتا۔ اسپرنگ اتنے اچھے اور بے آواز لگے ہوئے تھے کہ ذراسی جنبش سے گردن کا زاویہ بدلا جا سکتا تھا، اور گردن کا زاویہ بدل جانے سے آنکھوں کا زاویہ بھی بدل جاتا تھا۔ یہ عورت ڈرائنگ روم کے صوفے پر بیٹھ سکتی تھی، کروٹ بدل سکتی تھی۔ کھڑی رہ سکتی تھی۔ جس پوز میں چاہئے اس کے ہاتھوں کے زاویے آپ بدل سکتے تھے حسن نے بڑی احتیاط سے اسے پرکھا، جانچا اور ہر طرح سے اسے مکمل پایا۔ بیس ہزار روپے ضرور خرچ ہوئے تھے مگر گوشت پوست کی ایسی عورت دس لاکھ روپے میں بھی نہیں مل سکتی تھی، حسن بے حد خوش ہوا، فوراً ایک ڈبے میں رکھوا کر بحفاظت گھر لے گیا۔

اپنی سوچی ہوئی اسکیم کے تحت اس نے سب نوکروں کو چھٹی دے دی تھی اور ان چھ مہینوں میں اس نے کھانا پکانا سیکھ لیا تھا اور اپنے گھر کے مزدوری کام کاج میں بھی شُد بُد حاصل کر لی تھی۔ اس چھ ماہ کے عرصے میں وہ اس ربڑ کی عورت کے لئے انواع واقسام کے

کپڑے خریدتا رہا اور درزی سے سلواتا رہا تھا۔ عمدہ ساڑھیاں اور ان کے تمام وہ رنگ جو اس کے پسندیدہ تھے، کامدانی کے غرارے اور کڑھے ہوئے کرتے اور جھل جھل کرتے ہوئے نظر کو خیرہ کرنے والے دوپٹے اور جینز اور فراکس اور سینڈل اور سب سامان آرائش جو ایک عورت کے لئے بے حد ضروری ہوتا ہے۔

باہر کی کھڑکیاں اور دروازے بند کر کے اس نے ائرکنڈیشنر کھولا۔ ڈبے میں پیک کی ہوئی ربڑ کی عورت کو نکالا۔ اُسے کرتا غرارہ پہنایا۔ اس کے کانوں میں کرن پھول سجائے گلے میں گلوبند، ہاتھوں میں کنگن سجا کر اور بال کھلے رکھ کر اس نے اسے ایک صوفے پر بٹھا دیا۔ دیر تک اس عورت کے عقب میں ایستادہ لیمپ اسٹینڈ کے زاویے درست کرتا رہا اور شیڈ گھما گھما کر دیکھتا رہا کہ کس رُخ سے روشنی اس پر ٹھیک پڑتی ہے۔ سب ٹھیک ٹھاک کر کے اس نے ربڑ کی عورت کے قریب ایک تپائی پر پاندان کھول کر رکھ دیا، گویا کسی اعلیٰ خاندان کی نہایت ہی سگھڑ اور باسلیقہ خوبصورت لڑکی اس کے لئے پان بنانے میں مصروف ہے۔

وہ غالیچے میں اس عورت کے قدموں میں بیٹھ گیا، کہنے لگا "... یوں بہت خوبصورت لگتی ہو، بہت حسین، یوں پاندان پر جھکی ہوئی، گلوری بناتی ہوئی..... اب اپنے نازک ہاتھوں سے ایک گلوری بھی عنایت کر دو۔"

اتنا کہہ کر حسن نے پاندان میں سے خود ہی ایک پان بنا لیا اور اسے کھا کر بولا "سبحان اللہ! کیا ملائم گلوری تھی۔" پھر اُس نے ربڑ کی عورت کی لانبی مخروطی انگلیاں چوم لیں، بولا "گلوری کے فن کی نزاکت کوئی تم سے سیکھے۔ ایک اور عنایت ہو۔"

دوسری گلوری کھا کر حسن بولا "میں نے تمہارا نام زہرہ تجویز کیا ہے کیونکہ سچ مچ حسن و خوبی میں زہرہ سے مشابہ ہو۔ تمہاری نگاہ میں ایشیائی شرم ہے، جسم میں رودداں کے مجسموں

کی روانی ہے۔ حسن میں پیپنی مصور گویا کی نسائی مصوری کالوچ ہے اس لئے میں تمہارا نام زہرہ رکھتا ہوں۔ ٹھیک ہے نا؟

حسن نے مسکرا کر ربڑ کی عورت کی طرف دیکھا، پھر کہنے لگا: "شاباش! مجھے معلوم تھا تمہیں یہ نام پسند آجائے گا۔ تم بہت سمجھ دار عورت معلوم ہوتی ہو۔ میں تمہارا قائل ہوتا جارہا ہوں۔"

حسن نے دوسری بار اس کی انگلیوں کو چوما اور بولا: "اپنا بیڈ روم دیکھو گی؟"

جب ربڑ کی عورت نے کوئی جواب نہ دیا تو حسن بولا۔

"گڈ... ویری گڈ...." حسن مسکرانے لگا: "تم بول نہیں سکتیں، یہی تمہاری سب سے بڑی خوبی ہے۔ اس وقت اگر میری ان تین بیویوں میں کوئی بھی ہوتی تو اسی نام کے مسئلے کو لے کر ایک لمبی بحث چھڑ جاتی اور ممکن ہے مار پٹائی تک نوبت آجاتی: ایک آدھ گل دان ٹوٹتا، سات دن تک گھر میں تناتنی رہتی، مگر زہرہ تم تو بے حد عمدہ سلجھی ہوئی عورت ہو، تمہیں یقیناً یہ نام پسند ہے۔ ہوتے ہوتے تمہیں یہ گھر بھی پسند آجائے گا میں تمہیں یہاں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔ ایک عورت کو جو کچھ چاہیئے وہ سب اس گھر میں موجود ہے۔ تم چاہتی کیا ہو؟ کپڑے؟ میں نے تمہارا وارڈروب کپڑوں سے بھر دیا ہے۔ نت نئے ڈیزائن اور فیشن کے کپڑے، جو تم اب میری مرضی کے مطابق پہن سکو گی۔ سنگار میز پر چلو، تمہیں دکھاؤں تمہارے میک اپ کے لئے میں نے کہاں کہاں سے سامان فراہم کیا ہے۔"

حسن نے زہرہ کو اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ پھر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے بیڈروم کے اندر لے گیا، اسے سنگار میز کے سامنے تپائی پر بٹھا دیا۔

اب وہ سنگار میز کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس کے بال کمر تک لٹک رہے تھے اور ایک ہاتھ میں اس نے اسے کنگھی دے کر اس کے ہاتھ کو اتنا اونچا کر دیا جیسے وہ ربڑ کی عورت اپنے بالوں

میں کنگھی کر رہی ہو۔ وہ اسے سنگھار میز کے قریب بٹھا کر خود واپس ڈرائنگ روم میں چلا گیا اور وہاں سے بیڈ روم کی مدھم مدھم روشنیوں کے ہالے میں بیٹھی ہوئی اس عورت کو دیکھنے لگا جو اپنے بالوں میں کنگھی کرنے میں مصروف تھی وہ اس کا سندر سجیلا مکھڑا سنگھار میز کے تینوں آئینوں میں دیکھ رہا تھا۔ کہ بڑی بڑی روشن آنکھیں تھیں!

اب وہ کھانے کی میز پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ربڑ کی عورت کے ایک ہاتھ میں کانٹا تھا دوسرے میں چھری اور وہ پلیٹ پر تھوڑی سی جھکی ہوئی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

اس کے سامنے حسن بیٹھا اپنی پلیٹ میں کھانا کھا رہا تھا اور اس سے کہہ رہا تھا: "تم سوال کرو گی شادی سے بچنے کے لئے میں کوئی داشتہ بھی رکھ سکتا تھا، تم پر اس قدر روپیہ خرچ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ تمہارا سوال بالکل فطری ہے، مگر میں داشتائیں رکھ کے دیکھ چکا ہوں، وہ بیوی سے دگنی مہنگی ہوتی ہیں، بیوی سے زیادہ جھگڑالو ہوتی ہیں۔ پھر ایسی داشتا رکھنے سے کیا فائدہ؟ کیوں ٹھیک کہتا ہوں نہ میری جان؟ شاباش! کتنی جلدی معاملے کی تہ تک پہنچ جاتی ہو۔ تمہاری خاموش ذہانت کا اندازہ کر کے مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے۔ تم یقیناً کسی اعلیٰ ڈگری یافتہ عورت سے زیادہ عقل مند ہو۔ تمہاری میری خوب نبھے گی۔ یہ چوتھی شادی ہم دونوں کو یقیناً راس آئے گی۔

وہ بہت خوش تھا اور مگن۔ دفتر میں اب اس کا موڈ بہت ٹھیک رہتا۔ اپنے کام میں بھی اب وہ زیادہ مستعدی اور چستی دکھانے لگا تھا۔ ادھر اس فہم و فراست نے فرم کے کئی بگڑے کام بنا دے۔ فرم نے خوش ہو کر اس کی تنخواہ میں مزید اضافہ کر دیا۔ گھر پر بھی وہ بہت خوش رہتا۔ ربڑ کی عورت اس کے پسند کے کپڑے پہنتی تھی۔ اس کی پسند کا کھانا کھاتی تھی۔ جب وہ دفتر سے گھر آتا تو ڈرائنگ روم میں اسے صوفے پر کوئی کتاب پڑھتے ہوئے ملتی یا چھالیا کترتی ہوئی یا اس کے لئے سویٹر بنتی ہوئی۔ جس پوز میں وہ اسے چھوڑ جاتا اسی پوز میں وہ اسے واپسی پر ملتی، مسکراتے

ہوئے۔ اس کا انتظار کرتے ہوئے خاموش سے اس کی راہ تکتے ہوئے۔ کون عورت ایسا کرتی ہے ؟

وہ ربڑ کی عورت پاکر بہت خوش ہوا تھا۔ اس کے گھر کا سونا پن مٹ گیا تھا۔ تمام گھریلو جھگڑے اور رنجشیں بھی ختم ہو گئے تھے۔ ربڑ کی عورت ہر حالت میں دوسری عورتوں سے بہتر تھی۔ ایک تو ایسی عورت کا رنگ روپ نہیں بگڑتا، جسم کے اعضا کا تناسب نہیں بدلتا، دوسری عورتوں کی طرح وہ کبھی یک لخت موٹی نہیں ہو جاتی۔ کبھی دُبلی نہیں ہوتی۔ کبھی بیمار نہیں پڑتی۔ کبھی کھانا نہیں کھاتی۔ زیور نہیں مانگتی۔ میکے جانے کے لئے ضد نہیں کرتی۔ شاپنگ کے لئے پیسے نہیں مانگتی! جہاں بٹھا دو بیٹھی رہتی ہے، جہاں کھڑا کر دو کھڑی رہتی ہے۔ کبھی کسی بات پر جھگڑا نہیں کرتی ہے اور سب سے اچھی بات تو یہ ہے کہ بول ہی نہیں سکتی۔ سو خوبیوں کی ایک خوبی تو یہی ہے۔

حسن کا دل اس ربڑ کی عورت سے لگ گیا۔ دھیرے دھیرے وہ اس سے بیحد مانوس ہوتا گیا اب تو وہ گھنٹوں اس سے باتیں کرتا تھا۔ کچھ اپنی طرف سے کچھ اس کی طرف سے۔ خود ہی سوال کرتا خود ہی جواب دیتا۔ اور ہر معاملے میں اس کا اپنا ہی پلہ بھاری رہتا تھا۔ حسن ربڑ کی خاموش عورت کو بہت چاہنے لگا اور اسے نت نئے لباس پہناتا اور روز اسے ایک نام دیتا۔ کبھی مراٹھی، نوگزی ساڑھی پہناتا کبھی راجستھانی چوڑیا؟ کبھی بیلی ڈریس کبھی عربی لباس؟ کبھی جاپانی کمونو تو کبھی ہوائین ہولا ہولا ڈریس، جینز پہنا کے اسے دیکھتا کبھی محض بکنی پہنا کر باتھ روم کے ٹب میں سے ڈال دیتا۔

وہ اس سے ہر موضوع پر گفتگو کرتا تھا۔ دھیرے دھیرے اس کی خود کلامی اس قدر بڑھ گئی کہ اب وہ گھنٹوں اس میں معروف رہتا تھا۔ اب وہ خود ایک باتونی عورت کی طرح گفتگو کرنے لگا تھا مگر اسے اپنے اس نئے وصف کا احساس نہیں تھا، اور غالباً ہوگا بھی نہیں۔ کبھی کبھی اگر اس کا موڈ بُرا ہوتا تو وہ خود ربڑ کی عورت سے لڑ پڑتا۔ ایک رواں دواں ناک میں گنگناتے ہوئے لہجے میں شکایتوں کے دفتر کھول دیتا۔ وہ سب کچھ اس سے کہہ دیتا جو وہ آج تک اپنی پہلی

تین بیویوں سے نہیں کہہ سکا تھا۔ زہرہ مسکرا کر اس کی طرف دیکھتی رہتی اور پلٹ کر جواب نہ دیتی اور ہولے ہولے حسن کے دل کا غبار چھٹ جاتا اور بول بول کر وہ خود ہی چپ ہو جاتا۔ پھر خود ہی ایک طرفہ شکایت پر شرمندہ ہو کر ربڑ کی عورت کو گلے سے لگا کر اس سے معذرت چاہنے لگتا۔ دھیرے دھیرے وہ اس سے اس قدر مانوس ہو گیا کہ ربڑ کی عورت کو وہ اپنے مطالعے کے کمرے میں بھی لے جانے لگا۔ جہاں آج تک اس نے اپنی پہلی تین بیویوں میں سے کسی کو آنے کی اجازت نہ دی تھی۔ یہ اس کا خاص کمرہ تھا جہاں وہ کھانا کھا کے رات کو سونے سے چند گھنٹے پیشتر اپنے دفتر کی ضروری فائلیں دیکھا کرتا تھا۔

اب تو زہرہ اس کے ساتھ اس کمرے میں بھی جاتی تھی۔ وہ اسے اپنے قریب ایک کرسی پر بٹھا دیتا اور اس کا ایک ہاتھ اپنے کندھے پر رکھ لیتا اور پھر خود نہایت اطمینان سے دفتر کی فائلیں دیکھنے میں مصروف ہو جاتا۔ اسے احساس ہوتا کہ اس کی بیوی کا ہاتھ کندھے پر ہے وہ خاموشی سے اس کے قریب بیٹھی ہے اور وہ اس کے جسم کی خاموش قربت میں اپنے دفتر کا کام بہتر طریقے سے کر سکتا ہے۔ اب وہ زہرہ کو اپنی چوتھی بیوی سمجھنے لگا اور خوشی اور مسرت، اطمینان اور سکون کا ایک رچا ہوا احساس اس کے چہرے سے جھلکنے لگا۔

اچانک اس کی فرم نے اسے ایک ہفتے کے لئے پیرس بھیجنے کا فیصلہ کر لیا ایک فرنچ فرم سے چند پیٹنٹ خریدنے کی بات چیت ایک عرصے سے چل رہی تھی اور اب وہ بات چیت ایک نازک مرحلے پر پہنچ گئی تھی۔ اسے اس نازک موڑ سے نکال کے کامیابی سے اختتام تک پہنچانے کے لئے فرم نے حسن کی ذہانت اور فراست پر بھروسہ کیا تھا۔

دو دن کے بعد حسن کو پیرس روانہ ہونا تھا۔

پیرس جانے کے خیال سے حسن بہت خوش تھا۔ جب وہ سوچتا کہ وہ زہرہ کو ایک ہفتے

کے لئے پیچھے چھوڑے جارہا ہے تو اسے تھوڑا سا ملال بھی ہوتا، مگر پھر پیرس کی گلیوں کے مناظر، اس کے کھلے ریستورانوں کی زندگی، اس کے نشاط گھروں کی کیف رستی کا عالم اس کی نگاہوں میں گھومنے لگتا تو ملال کا یہ احساس چند لمحوں کے لئے مٹ جاتا، اور پیرس کی دل کش رنگینیاں قوس قزح کی طرح اس کے دل و دماغ پر چھا جائیں۔ ایک ہفتے کے لئے وہ بھی کھل کھیلے گا۔ جی بھر کے دادِ نشاط دے گا۔ ٹھیک ہے گھر میں ربڑ کی عورت ہے۔ گھر کے سونے پن کو دُور کرنے کے لئے۔ مگر یہاں بھی اپنے جنسی جذبے کی تسکین کے لئے اسے عارضی دوستیاں تو کرنی پڑتی ہیں، اِدھر اُدھر جانا بھی پڑتا ہے۔ ہوس کی آگ کو بجھانے کے لئے، اس لئے پیرس وہ اکیلا ہی جائے گا۔ زہرہ کو ساتھ نہیں لے جائے گا۔

"سات دن کی تو بات ہے!" رات کو اس نے ربڑ کی عورت سے کہا، سات دن کے بعد میں پیرس سے لوٹ آؤں گا۔ میرا جی خود وہاں نہیں لگے گا۔ تمہارے بغیر مگر کیا کروں؟ فرم کا معاملہ ہے، جانا ہی پڑے گا۔

"ہر دم تمہاری یاد آئے گی۔ اور ایک ایک لمحے تم کو یاد کروں گا میری جان! اور تمہارے بغیر پیرس مجھے ایسا لگے گا جیسے مسولی پٹم یا گورداس پور یا بھیکم پور یا ایسا ہی کوئی مضحکہ خیز شہر...... مگر مجبوری ہے۔ پریشان نہ ہونا، میں سات دن کے بعد لوٹ آؤں گا تمہارے پاس، اپنی زہرہ کے پاس۔ پیرس میں کیا رکھا ہے میرے لئے؟ ساتوں دن سنجیدہ گفت گو کا سلسلہ چلتا رہے گا۔ ایسی مصروفیت رہے گی کہ کہیں جانے کی فرصت تک نہ مل سکے گی۔ تم بس یہ سمجھ لو کہ جیسے دفتر جاتا ہوں اور وہاں سے لوٹ آتا ہوں۔ ویسے ہی پیرس جاؤں گا اور وہاں سے لوٹ آؤں گا۔

"مجھ پر بھروسہ رکھو ڈارلنگ۔ میں ایک وفادار خاوند ہوں۔ میں اپنی زہرہ کو کبھی دھوکہ نہیں دے سکتا!"

ربڑ کی عورت اس کے ساتھ کے پلنگ پر اس کی طرف کروٹ لے کر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے ہونٹ گو مسکرا رہے تھے مگر حسن کو ایسا لگا جیسے اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں اُداسی کی ایک خفیف سی جھلک اُچلی ہے۔

وہ کروٹ بدل کے سوگیا اور پیرس کے خوابوں میں کھو گیا:

فالیز برژے، عریاں اور نیم عریاں ناچتی ہوئی رقاصائیں، رائین کے کنارے کلب نمبر، کے ہنگامے اور آدھی رات کے بعد بید مجنوں کی روتی ہوئی ڈالیوں تلے چھپی۔ ڈولتی ہوئی کشتیوں میں اوس سے بھیگتے ہوئے پیار کے پیکر......

دو گھنٹے کے بعد جہاز جانے والا تھا۔ کم سے کم پینتالیس منٹ پہلے اسے ہوائی اڈے پر پہنچ جانا چاہیئے۔ وہ دفتر سے سیدھا گھر آیا۔ سامان اس نے پہلے سے باندھ کر رکھ دیا تھا۔ جلدی جلدی اس نے گھر کے سب کواڑ اور کھڑکیاں بند کیں۔ سب کمروں کے پردے گرا دیئے: بجلی کے سوئچ آف کر دیئے، پانی کے نل بند کر دیئے، تجوری کو چابی لگائی، الماری اور وارڈروب کو اچھی طرح سے بند کیا، دو روشن دان غلطی سے کھلے رہ گئے تھے انہیں بھی بند کیا۔ ان سب کاموں سے فارغ ہو کر حسن ربڑ کی عورت کے پاس آیا جو ڈرائنگ روم کے ایک صوفے پر بیٹھی گویا حسرت ناک نگاہوں سے حسن کی طرف دیکھ رہی تھی۔

آج حسن نے اسے بنگالی اسٹائل کی ایک ساڑھی پہنائی تھی۔ ماتھے پر بندیا لگائی تھی، پاؤں میں آلتا، اور چاندی کے کمر زیب سے چابیوں کا ایک گچھا جھول رہا تھا۔ ربڑ کی وہ عورت شکل و صورت سے بالکل ایک بنگالن گرہستن معلوم ہوتی تھی بال کمر تک کھلے، بالوں میں پھول، ہاتھوں میں دبنا۔ آج اس کا نام آشا تھا۔

ڈرائنگ روم کی سب کھڑکیاں بند کر کے حسن نے ربڑ کی عورت سے کہا:

"آشا، چلو اپنے بیڈ روم میں، سات دن تم وہیں رہوگی۔ میں بیڈ روم کو باہر سے تالا لگا کے جاؤں گا۔ بالکل محفوظ رہوگی۔ دن کو گورکھا پہرہ دے گا، رات کو چوکیدار۔ کسی طرح کا خطرہ نہیں ہے میری جان۔"

وہ ربڑ کی عورت کو اٹھا کے بیڈ روم میں لے گیا۔ اسے پلنگ پر لٹا دیا۔ پھر اسے لٹا کر اپنے کمرے میں گیا۔ بندھے ہوئے سامان کو باہر ڈرائنگ روم میں لایا سامان کا اچھی طرح سے جائزہ لیا۔ پھر ڈرائنگ روم سے بیڈ روم کی طرف دیکھا جہاں پر اس نے ربڑ کی عورت کو ایک پلنگ پر لٹا دیا تھا۔

پھر اس نے جلدی سے اپنے ضروری کاغذات دیکھے۔ دوبارہ دیکھے پاسپورٹ ہوائی جہاز کا ٹکٹ، اس کے ایک دوست کا پتا جو گذشتہ آٹھ برس سے پیرس میں مقیم تھا اور پیرس کی نشاط نگاہوں کا ماہر تھا۔ حسن کے چہرے پر ایک رازدارانہ تبسم آیا۔ اس نے اپنے چہرے پر کوشش کرکے سنجیدگی اور کسی قدر اُداسی کے تاثرات پیدا کئے اور بیڈ روم میں آخری بار الوداع کہنے کے لئے گیا۔

ربڑ کی عورت کا بت پلنگ پر خاموش، چُپ چاپ لیٹا تھا۔ سر کے اوپر ذرا سا گھونگھٹ بڑھ آیا تھا۔ گھونگھٹ میں سُرخ بندیا چمک رہی تھی اور سیندور بھری مانگ نیم وا آنکھوں کی لانبی پلکیں گلابی رخساروں پر کانپ رہی تھیں۔ حسن کو ایسا لگا جیسے اس کا پورا چہرہ حسرت و یاس میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس نے بڑے پیار سے ربڑ کی عورت کا رخسار تھپتھپا کے کہا۔

"پگلی روتی کیوں ہے؟ سات دن میں واپس آجاؤں گا۔ سات دن ہوتے ہی کتنے ہیں! اس پلنگ پر لیٹے لیٹے تمہیں ایسے لگے گا۔ جیسے ایک نیند لے لی۔ ایں؟ ٹھیک! اچھا۔ گڈ بائی!"

حسن ہاتھ ہلا کے ڈرائنگ روم کی طرف جانے لگا کہ یکایک اسے محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ حیرت زدہ ہو کے وہ پیچھے گھوما تو اس نے دیکھا کہ ربڑ کی عورت اُٹھ کر پلنگ پر

بیٹھ گئی، اس نے بڑی مضبوطی سے حسن کا دامن پکڑ رکھا ہے، وہ بڑے کڑوے لہجے میں اس سے کہہ رہی ہے۔

"کیوں جی! کیا اسی واسطے مجھے گھر لائے تھے کہ مجھے اکیلا چھوڑ کر پیرس جاؤ اور وہاں سے کسی مردار، ماٹی ملی فرنچ میم کو لے کر آؤ؟ ناں! ایسے نہ جانے دیا میں نے! میں ربڑ کی ہوں تو کیا ہوا؟ آخر عورت تو ہوں! ایسی کچی گولیاں میں نہیں کھیلی ہوں۔ صاف صاف کہے دیتی ہوں، جہاں تم جاؤ گے وہاں میں بھی جاؤں گی تمہارے سنگ، تمہارے ساتھ ساتھ جاؤں گی، ورنہ تم کو بھی نہیں جانے دوں گی۔ کان کھول کے سن لو ابھی سے، ہاں!"

دانی

دانی لمبا اور بدصورت تھا۔ اُس کی ٹانگوں اور بانہوں پر بال کثرت سے تھے۔ اور بے حد کھُردرے تھے۔ صبح سویرے چارک روڈ کے ہائیڈرنیٹ پر نہاتے ہوئے وہ دُور سے دیکھنے والوں کو بالکل بھینس کا ایک بچہ معلوم ہوتا تھا۔ اُس کے جسم میں واقعی ایک بیل کی سی طاقت تھی۔ اُس کا سر بڑا۔ ماتھا چوڑا اور کھوپڑی بڑی مضبوط تھی۔ دن بھر وہ چارک روڈ کے نالے پر ایرانی ریستوران میں بڑی مستعدی سے کام کرتا۔ اور رات کو ٹھرّا پی کر ایک مینڈھے کی طرح سر نیچا کر کے ہر کس و ناکس سے کہتا: "آؤ میرے سر سے ٹکر مارو۔" مگر یار لوگ ہنس کر طرح دے جاتے تھے۔ کیونکہ دانی کا سر ہی نہیں اُس کا جسم بھی بے حد مضبوط تھا۔ دو تین بار تھوگا بین اور ڈوراگی کے چند کسرتی نوجوانوں نے اُس کا چیلنج منظور کرتے ہوئے اُسے ٹکر پر گھیرا تھا۔ اور نتیجے میں اپنے سر پھُڑا کر چلے گئے تھے۔ پھر کسی میں ہمت نہ ہوئی کہ دانی کے سر سے ٹکرا سکے۔

غالباً دانی کے سر میں ہڈی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اگر مغز کا گودا ہوتا۔ تو وہ باآسانی تھوڑی سی عقل صرف کر کے بمبئی کا دادا بن سکتا تھا۔ اُس سے کم ڈیل ڈول اور طاقت والے نوجوان اپنے اپنے علاقوں کے ذی اثر دادا بن چکے تھے۔ اور غنڈوں کی پلٹنوں پر حکومت کرتے تھے۔ شراب سمگل کرتے تھے۔ سٹہ کھلاتے تھے۔ سینما کے ٹکٹ بلیک میں بیچتے تھے۔ رنڈیوں کے کوٹھے چلاتے تھے۔ اور الیکشن کے موقعے پر اپنے علاقے کے ووٹ بیچتے تھے۔

مگر شاید دانی کی کھوپڑی میں بھیجا نہ تھا۔ کیونکہ اُسے اس قسم کے تمام کاموں سے اُلجھن سی ہوتی تھی۔ جب کوئی اُسے اس قسم کا مشورہ دیتا تو اس کے چہرے پر شدید بیزاری کے اثرات نمایاں ہو جاتے اور وہ کہنے والے کی طرف اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور بھی چھوٹی کر کے، ہونٹ بھینچ کے سر جھکا کے۔ کندھے پکڑ کے ایک حملہ کرنے والے مینڈھے کی طرح خطرناک پوز لے کر کہتا۔ "پھر ایسا بولا تو ٹکر ماروں گا"

اور مشورہ دینے والا کھسیا کر یا ہنس کر پرے ہٹ جاتا۔

دانی کو پڑھنے سے نفرت تھی۔ وہ تعلیم یافتہ آدمیوں کو بڑی حقارت سے دیکھتا تھا۔ دانی کو شہرت سے نفرت تھی۔ جب کبھی کسی بڑے اور مشہور آدمی کا جلوس چارک چوک سے گزرتا۔ اور اس عظیم الشان ہستی کو پھولوں میں لدے ہوئے ایک کھُلی کار میں بیٹھے ہوئے دو رویہ ہجوم کی سلامیں لیتا ہوا دیکھتا تو کہتا۔

"واہ۔ کیا سجا ہوا مینڈھا ہے۔ اس سے پوچھو، میرے سر سے ٹکرے گا؟"

واقعی ذرا غور کرو تو صرف جنگ آزادی کے دنوں میں دُبلے پتلے لیڈر آتے تھے۔ آج کل جوں جوں عوام کی حالت پتلی ہوتی جاتی ہے۔ لیڈر موٹے ہوتے جاتے ہیں۔ اس قدر لحیم و شحیم اور موٹے تازے دستیاب ہوتے ہیں آج کل۔ کہ ان پر باآسانی کسی مینڈھے یا ناگوری بیل

کا شبہ کیا جا سکتا ہے۔

دانی کو سیاست سے بھی سخت نفرت تھی۔ اُونچی سیاست تو خیر اُس کے پلے ہی نہ پڑتی تھی۔ لیکن وہ جو ایک سیاست ہوتی ہے۔ گلی محلے۔ بازار اور رستوران کی، وہ بھی اُس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ بس اُسے صرف کام کرنا پسند تھا۔ حالانکہ دانی مسلسل سولہ گھنٹے کام کرنے کے لئے تیار تھا۔ مگر رستوران کا مالک بھی کیا کرے، وہ قانون کے ہاتوں مجبور تھا۔ اور دانی اپنی فطرت کے ہاتوں۔ اس لئے وہ صبح سویرے سب سے پہلے رستوران میں آتا اور سب نوکروں کے بعد جاتا۔ اور دن بھر کھڑے کھڑے رہ کر انتہائی چوکسائی سے سب کام سب سے پہلے کرتا۔ اور جب رستوران بند ہو جاتا۔ اور دن بھر کی مشقت سے بھی دانی کا جسم نہ تھکتا۔ تو وہ انتہائی بیزار ہو کر تھرّا پی لیتا اور فٹ پاتھ پر کھڑا ہو کر اپنے دوستوں سے ٹکریں لڑانے کو کہتا اور جب کوئی تیار نہ ہوتا۔ تو وہ مایوس ہو کر اپنا بدن ڈھیلا چھوڑ دیتا اور فٹ پاتھ پر گر کر سو جاتا۔ بس یہی اُس کی زندگی تھی۔

کم و بیش یہی اُس کے دوسرے ساتھیوں کی زندگی تھی۔ جو اُس کے ساتھ رستوران میں کام کرتے تھے۔ اور اُسی فٹ پاتھ پر سوتے تھے۔ جو چارک چوک کے رستوران کے بالکل سامنے سڑک پار کر کے چارک چرچ کے سامنے واقع ہے۔ چارک چرچ کے چھوٹے سے میدان میں ایک طرف نیلے پتھروں کا بنا ہوا ایک خوبصورت گراٹو ہے۔ جس میں مقدس ماں کا بُت ہے۔ ایک طرف گل مہر کے دو پیڑ ہیں۔ جن کا سایہ دن میں فٹ پاتھ کے اُس حصے کو ٹھنڈا رکھتا ہے۔ اُن پیڑوں کی چھاؤں میں غریب عیسائی۔ مومی شمعیں۔ یسوع مسیح اور مریم کے مومی بُت اور گیندے کے ہار بیچتے نظر آتے ہیں۔ دو بھکاری دن میں بھیک مانگتے ہیں اور رات کو کہیں غائب ہو جاتے ہیں۔ فٹ پاتھ پر سڑک کے کنارے چھتے ہوئے بس سٹاپ ہیں، جہاں بس کا کیو لگانے والوں کے

علاوہ آس آپس کے نوجوانوں کا بھی مجمع رہتا ہے۔ کیونکہ یہ بس سٹاپ مسافروں کے ویٹنگ روم ہی نہیں۔ عاشقوں کے ملاقات گھر بھی ہیں۔ پانچ بجے ڈی سٹاپ پر مل جانا۔ روزی گرجا سے نکلتے ہوئے دزدیدہ نگاہوں سے اپنے عاشق وکٹر کو دیکھتی ہوئی آہستہ سے کہتی ہے اور پھر اپنی خوفناک اماں کے ساتھ گھبرا کر آگے بڑھ جاتی ہے۔ اور پھر وکٹر یا جیمس یا چارلس دھڑکتے ہوئے دل سے اور بے چین نگاہوں سے کبھی گھڑی دیکھتا ہوا۔ کبھی اپنی پیٹی کستا ہوا روزی کا انتظار کرتا ہے۔ ساڑھے چار بجے ہی سے۔ اور دیکھتا ہے کہ جوزف اپنی ڈیزی کو لے کر گیا۔ اور ٹام اپنی ازابیل کو لے کر بھاگا اور شیلا فوجا سنگھ کے ساتھ چلی گئی۔ اس سالی شیلا کو کوئی عیسائی پسند ہی نہیں آتا۔ بلڈی شٹ! اور یہ لارا بھی گئی۔ اُس یہودی چھوکرے کے ساتھ۔ جس کا جانے کیا نام ہے۔ لیکن جو ہر روز پانچ بجے اپنی موٹر سائیکل یہیں کھڑی کرتا ہے۔ اب ساڑھے پانچ ہو گئے۔ اب پونے چھ ہو گئے۔ اب اگر روزی نہیں آئی۔ تو وہ لوگ گن آف نواران نہیں دیکھ سکتے۔ اور اُس کے دونوں ٹکٹ بے کار ہو جائیں گے۔ اب وہ اکیلا گن آف نواران دیکھ کر کیا کرے گا۔ سن آف ایگن۔ چھ بج گئے۔ روزی نہیں آئی۔ وہ نہیں آئے گی۔ شاید وہ فرانسس کے ساتھ چلی گئی جس کے ساتھ اس کی ماں۔ اس کی شادی کرنا چاہتی ہے۔ بلڈی سوائین۔ وہ فرانسس کو گولی مار دے گا۔ روزی کو بھی گولی مار دے گا۔ اور اس کی منحوس ماں کو جو ہر وقت سائے کی طرح روزی کے ساتھ لگی رہتی ہے۔ وہ برگانزا فیملی کے ہر فرد کو گولی سے مار دے گا۔ اور پھر خود بھی گولی مار کر مر جائے گا۔ یکایک وکٹر نے دور سے روزی کو ہلکے لیمن رنگ کے تافیتا فراک میں پھولوں کی ایک شاخ کی طرح جھولتے دیکھا۔ اور اُس کے دل سے گولی مارنے کا خیال اک دم نکل گیا۔ اور اُس کا چہرہ مسرت سے کھل اُٹھا اور وہ بے اختیار روزی کی طرف بھاگا۔ اور بھاگتے بھاگتے ایک دوڑتی ہوئی لاری کے نیچے آنے سے بال بال بچ گیا۔ روزی کے

منہ سے خوف کی ایک چیخ نکلی۔ مگر دوسرے لمحے میں وکٹر کا ہاتھ اُس کی کمر میں تھا۔ اور وہ اُسے دوڑاتے ہوئے لاریوں، گاڑیوں، ٹیکسیوں کی بھیڑ سے نکالتے ہوئے ڈی بس کے سٹاپ پہ لے گیا۔ بس چل چکی تھی۔ مگر دونوں نے دوڑ کر اُسے پکڑ لیا۔ پہلے وکٹر نے پکڑا۔ پھر اس نے ہاتھ سے زور کا جھٹکا دے کر روزی کو اوپر کھینچ لیا۔ چند لمحوں کے لئے روزی کا یمن رنگ فراک کا گول گھیرا تماشائیوں کی نگاہوں میں گھوما۔ پھر وہ دونوں پھولی ہوئی سانسوں میں ہنستے ہوئے ایک دوسرے کو بازو سے پکڑے ہوئے ڈی بس کی اوپر کی منزل میں چلے گئے۔ جہاں سے آسمان نظر آتا ہے اور ہوا تازہ ہوتی ہے اور نیچے سڑک پر۔ مرد عورتیں بچے سنگیت کے سُروں کی طرح بکھرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ کون کہتا ہے محبت کرنے کے لئے پہلگام نینی تال یا دارجلنگ جانا ضروری ہے۔ محبت کرنے والے تو کسی بس سٹاپ پر کھڑے ہو کر بھی اپنی جان پر کھیل کر محبت کر جاتے ہیں۔

مگر دانی کو عورتوں سے بھی دلچسپی نہ تھی۔ اس لئے جس رات اُس نے ثریا کو غنڈوں کے ہاتھوں سے بچایا۔ اُس کے دل میں ثریا سے یا کسی عورت سے بھی محبت کرنے کا کوئی خیال تک پیدا نہ ہوا تھا۔ پیچھے مُڑ کر دُور دُور تک جب وہ نظر ڈالتا تو اُسے اپنی زندگی میں کوئی عورت دکھائی نہ دیتی۔ بہت دُور بچپن میں اُسے ایک زرد رُو مایوس چہرہ دکھائی دیا تھا۔ جس نے اُسے ایک جھونپڑے سے باہر نکال کر اس کے چچا کے حوالے کر دیا تھا۔ اس سے زیادہ اُس کے دل میں اپنی ماں کی کوئی یاد نہ تھی۔ پھر اُس کے ذہن میں ایک خوفناک چچی کی صورت تھی۔ جو متواتر چار برس تک اُسے پیٹتی رہی تھی۔ ذرا بڑا ہونے پر وہ فوراً ہی اپنی چچی کے گھر سے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ اور جب سے وہ آزاد تھا۔ مگر ہمیشہ وہ اپنی بھوک کے ہاتھوں عاجز رہا۔ اُسے بہت بھوک لگتی تھی۔ اس وجہ سے اس کی ماں نے اُسے اس کے چچا کے

حوالے کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ فاقوں سے اپنے بیٹے کا پیٹ نہیں بھر سکتی تھی۔ اور آج دانی کہہ سکتا تھا کہ اُس کی چچی بھی کوئی نامہربان عورت نہ تھی ہرگز کوئی ظالم عورت نہ تھی۔ مگر اس کے اپنے پانچ بچے تھے۔ اور دانی کی بھوک اپنی وسیع اور عریض۔ جید اور مضبوط۔ بلند اور دیوزاد تھی کہ چچی نے اُس کے بار بار کھانا مانگنے پر مجبور ہو کر اُسے پیٹنا شروع کر دیا تھا۔ وہ دانی کو نہیں پیٹتی تھی۔ وہ اُس کی بھوک کو پیٹتی تھی۔ اور آج بھی کتنی ہی بیویاں اور شوہر مائیں اور بیٹے اور بہوئیں اور نندیں اور بھاوجیں اور چچیرے بھائی اور ممیرے بھائی۔ اور دوست اور یار اور دل کے پیارے اور جگر کے ٹکڑے ہیں جو اس بھوک کی خاطر ایک دوسرے کو پیٹتے ہیں۔ دھوکا دیتے ہیں۔ بے وفائی کرتے ہیں۔ جان لیتے ہیں۔ پھانسی پر چڑھ جاتے ہیں۔ مگر کوئی اُس ظالم دیوزاد خوفناک بھوک کو پھانسی نہیں دیتا۔ جس کے منحوس وجود سے اُس دنیا میں کوئی انسانی رشتہ اور کوئی تہذیب قائم نہیں ہے۔

دانی یہاں تک تو نہ سوچ سکتا تھا۔ وہ جب بھی سوچنے کی کوشش کرتا تھا۔ اُس کے ذہن میں ایک بہت بڑی خوفناک بھوک کا خیال آتا تھا۔ جس کی وجہ سے اُس کی ماں نے تنگ آ کے اُسے اُس کے چچا کے حوالے کر دیا۔ جس کی وجہ سے اُس کی چچی اُسے دن رات چار سال تک مارتی پیٹتی رہی۔ اور جس کی وجہ سے وہ آگے جا کر اپنی زندگی میں بار بار مختلف ہاتوں سے پٹا اور مختلف گھروں سے نکالا گیا۔ اس لئے اُس کے ذہن میں عورت کی محبت۔ باپ کی شفقت۔ دوست کی رفاقت۔ کسی کا کوئی احساس نہ تھا۔ ایک مسلسل تشنہ ترسی ہوئی ناآسودہ بھوک کا احساس تھا۔ جو بچپن سے جوانی تک اُس کے ساتھ چلا آیا تھا۔ چونکہ اس کا بدن دوسروں سے دُگنا لمبا اور بڑا تھا۔ اس لئے وہ دوسروں کے مقابلے میں دُگنی خوراک کا طالب تھا۔ دانی کو زندگی بھر ایک ہی ارمان رہا۔ کوئی اسے پیٹ بھر کر کھانا دے

دے اور پھر چاہے اُس سے چوبیس گھنٹے مشقت کرائے۔ مگر دانی کا یہ خواب چارک رو ڈکے ایرانی رستوران ہی میں آکے پورا ہوا۔ ایرانی رستوران کا مالک اُس سے چار آدمیوں کے برابر مشقت کراتا تھا۔ مگر پیٹ بھر کے کھانا دیتا تھا اور بیس روپے تنخواہ دیتا تھا۔ جس سے ٹھرّا پیتا تھا۔ اور پیٹ بھر کے کھانا کھاکے اور ٹھرّا پی کے وہ فٹ پاتھ پر سو جاتا تھا۔ اور اُسے دولت اور سیاست، اور شہرت اور عورت وغیرہ کسی چیز کی پرواہ نہ تھی۔ اب وہ دُنیا کا خوش قسمت ترین زندہ انسان تھا۔

جس رات ثریا کو اس نے غنڈوں کے ہاتوں سے بچایا تو اس کو بھی اُس کے دولت علی اکبر نے اُسے بہت منع کیا تھا۔ تین چار غنڈے مل کے ثریا کو ایک ٹیکسی میں بھگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جو چرچ کے آہنی جنگلے سے باہر فٹ پاتھ کے کنارے کھڑی تھی۔ چوک کا سپاہی ایسے موقعے پر کہیں گشت لگانے چلا گیا تھا۔ جیسا کہ ایسے موقعے پر اکثر ہوتا ہے۔ ثریا خوف اور دہشت سے چلّا رہی تھی۔ اور مدد کے لئے پکار رہی تھی۔ اور علی اکبر نے دانی کو بہت سمجھایا تھا۔ یہ بمبئی ہے۔ ایسے موقعوں پر یہاں کوئی کسی کی مدد نہیں کرتا۔ ایسے موقعے پر سب لوگ کان لپیٹ کے سو جاتے ہیں۔ تم بھی سو جاؤ۔ حماقت مت کرو۔ مگر دانی اپنے کانوں میں انگلیاں دینے کے باوجود ثریا کی چیخوں کی تاب نہ لا سکا۔ اور اپنی جگہ سے اُٹھ کر ٹیکسی کی جانب بھاگا۔ غنڈوں کے قریب جا کے اُس نے اُن سے کوئی بات چیت نہیں کی۔ اُس نے سر نیچا کر کے ایک غنڈے کے سر میں ٹکّر ماری۔ پھر دوسرے کے۔ پھر پلٹ کر تیسرے کے۔ اگلے چند لمحوں میں تینوں غنڈے فرش پر پڑے تھے۔ اور ان کے سر پھٹ گئے تھے۔ پھر پلٹ کر دانی نے جو چوتھے غنڈے کیطرف دیکھا تو وہ جلدی سے ثریا کو فٹ پاتھ پر چھوڑ کر ٹیکسی کے اندر کود گیا۔ اور ٹیکسی والا گاڑی سٹارٹ کر کے۔ یہ جا وہ جا دانی مینڈے کی طرح سر نیچا کر کے ٹیکسی کے پیچھے بھاگا۔ مگر موٹر کا پہیہ بہت

تیز رفتار ہوتے ہیں۔ اس لئے دانی مایوس ہو کر پلٹ آیا۔ اور واپس آکر ثریا سے پوچھنے لگا۔

"یہ لوگ کون تھے ؟"

"ایک تو میرا بھائی تھا" ثریا نے سسکتے سسکتے کہا۔

"تمہارا بھائی تھا ؟" دانی نے پوچھا۔

"ہاں" ثریا نے سر ہلا کر کہا "وہ مجھے ان غنڈوں کے ہاتھ فروخت کر رہا تھا"

"کتنے روپیوں میں ؟"

"تین سو روپیوں میں" ثریا نے جواب دیا۔

"پھر ؟"

"پھر میں نہیں مانی"

"تم کیوں نہیں مانیں ؟"

"میں چھ سو مانگتی تھی"

"تم چھ سو مانگتی تھیں ؟" دانی نے حیرت سے پوچھا "وہ کیوں ؟"

"میرا بھائی تین سو روپے لے جاتا تو مجھے کیا ملتا۔ میں جو بک رہی تھی تو مجھے بھی کچھ ملنا چاہیئے تھا" ثریا نے دانی کو سمجھایا۔

دانی خفا ہو کے بولا "واہ ! جو چیز بیچی جاتی ہے۔ اُسے کیا ملتا ہے ؟ ایسا دستور تو ہم نے زندگی میں کہیں نہیں دیکھا نہ سُنا۔ ہماری دوکان سے جو گاہک چار آنے کا کھارا بسکٹ خریدتا ہے۔ اُسے چار آنے کے عوض کھارا بسکٹ ملتا ہے۔ دوکاندار کو چار آنہ ملتا ہے۔ مگر کھارا بسکٹ کو کیا ملتا ہے ؟ ایں !"

میں کھارا بسکٹ نہیں ہوں ؟ ثریا غصے سے بولی۔

دانی نے سر سے پاؤں تک ثریا کو دیکھا۔ جوان، تیز اور تیکھی اور نکیلی اور سانولی۔ بولا
"مگر بالکل کھارا بسکٹ کی طرح لگتی ہو۔"

ثریا مسکرائی، کچھ شرمائی۔ اگر وہ ساڑھی پہنے ہوئے ہوتی تو ضرور اس وقت اُس کا پلّو اپنے سینے پر لے لیتی کہ ایسے موقعوں پر عورتوں کی ایک یہ پیٹینٹ ادا ہوتی ہے۔ مگر اس بے چاری نے تو سیاہ بلاؤز پہن رکھا تھا۔ اس لئے اُس نے صرف گردن جھکانے پر اکتفا کی۔

دانی پلٹ کر فٹ پاتھ پر اپنی جگہ پر آگیا۔ اور بولا "اچھا اب جاؤ۔ کہیں دفعہ ہو جاؤ۔"

ثریا اس کے پیچھے پیچھے آتے ہوئے بولی۔ "مجھے بھوک لگتی ہے۔"

ایرانی کارستواں تو بند ہو چکا تھا۔ اس لئے دانی اُس کے لئے ڈورا گلی کے ایک چائے خانے سے۔ چائے پاؤ اور آملیٹ اُدھار پر لایا۔ اور جس طرح سے ثریا نے اُسے کھایا، اُس سے معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی بھوک میں بھی دانی کا سٹائل جھلکتا ہے۔ دو لقموں میں وہ چار سلائس کھا گئی۔ ایک لقمے میں آملیٹ۔ پھر اُس نے ایک ہی گھونٹ میں ساری چائے اپنے حلق سے نیچے اُتار دی۔ دانی اُس کی اس حرکت پر بے حد خوش ہوا۔ یکایک اُسے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے اُسے ایک جگری دوست مل گیا۔ بولا

"تمہیں بہت بھوک لگتی ہے؟"

"بہت۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟" دانی نے اب پہلی بار اُس سے اُس کا نام پوچھا۔

"ثریا یعنی سونا!" ثریا جھجکتے جھجکتے بولی۔

"میں دانی ہوں۔" دانی اپنے سینے پر اُنگلی رکھتے ہوئے بولا۔ "یعنی ڈینیل!"

پھر وہ دونوں حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے اور یکایک پہلی بار اُنہیں آسمان

بہت صاف دکھائی دیا۔ اور دور سمندر سے نغنے کی صدا آنے لگی۔ اور میٹھی گداز رات گل مہر کے
پھول پہنے ان کے ترسے ہوئے جسموں کے قریب سے گزرتی گئی۔

روز رات کو فٹ پاتھ پر دانی اور ثریا کا جھگڑا ہوتا تھا۔ کیونکہ دانی نے ثریا کو ایرانی رستوران کے کچن میں نوکر کرا دیا تھا۔ پہلے تو اس نے کئی دن تک ثریا کو فٹ پاتھ سے بھگانے کی کوشش کی۔ وہ بینڈے کی طرح سر جھکا کے جب ثریا کی جانب رُخ کرتا تو ثریا وہاں سے بھاگ جاتی۔ اور دانی کے سو جانے کے بعد واپس اُسی فٹ پاتھ پر چلی آتی اور ہولے ہولے اس کے پاؤں دابنے لگتی اور جب صبح سویرے دانی اُٹھتا تو اُسے اپنا بدن بہت ہلکا اور عمدہ اور مضبوط معلوم ہوتا۔ اور وہ دیکھتا کسی نے اُس کی بنیان دھو دی ہے۔ اور قمیض اور پتلون بھی تو پہلی بار اُسے زندگی میں ایسا معلوم ہوا جیسے وہ اپنے گھر میں آگیا ہو۔ پہلی بار اس نے ثریا کی اُنگلیوں کو ایک عجیب انوکھے انداز میں دیکھا۔ وہ دیر تک اُس کے ہات پر اپنا ہات پھیرتا رہا۔ پھر راتوں کو اُسے فٹ پاتھ پر اپنا بستر اور تکیہ لگا ہوا ملنے لگا اور وہ جگہ بھی صاف ستھری اور مسلسل جھاڑ پونچھ سے چمکتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ جہاں وہ ہر روز سوتا تھا۔ اور وہ ثریا کے وجود کا عادی ہوتا گیا۔ مگر اب بھی ہر روز کھانے کے وقت رات کو فٹ پاتھ پر دونوں کی لڑائی ہوتی تھی۔ کیونکہ ثریا بھی بہت کھاتی تھی اور دانی بھی۔ دونوں رات کا کھانا رستوراں سے لے آتے تھے اور مل کر کھاتے تھے اور دونوں کی کوشش یہ ہوتی تھی۔ کہ کون کس سے زیادہ کھاتا ہے۔ اکثر اوقات دانی کامیاب رہتا تھا۔ لیکن جس دن ثریا زیادہ کھانے میں کامیاب ہو جاتی تھی۔ اُس نے وہ دانی کے ہاتھوں مزہ پٹتی تھی۔

ایک دن ثریا نے دانی سے کہا۔

"اب تم مجھے مت پیٹا کرو۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ اب میرے بچہ ہونے والا ہے۔" ثریا نے اُسے سمجھایا۔

دانی نے یکایک کھاتے کھاتے ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ حیرت سے ثریا کو سر سے پاؤں تک دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

"بچہ؟"

"ہاں!" ثریا خوش ہوکر بولی۔

"وہ بھی کھائے گا؟" دانی کی آواز میں خوشی کے ساتھ ساتھ خفیف سی مایوسی بھی تھی۔

"ہاں وہ بھی کھائے گا۔" ثریا نے اُسے سمجھایا۔ "پہلے تو میں ایک تھی۔ اب دو ہوں۔ ایک میں۔ ایک میرا بچہ۔ تمہارا بچہ۔ پیٹ میں۔ اب ہم دو ہیں۔ ہم دونوں کو زیادہ روٹی ملنی چاہیے۔"

دانی نے اپنے سامنے فرش پر پڑے ہوئے کاغذ کے ٹکڑے پر کھانے کو دیکھا۔ پھر اُس نے ثریا کو دیکھا۔ پھر اُس نے اپنا منہ بڑی سختی سے بند کیا۔ اور دونوں جبڑوں کو ہلا کر اس طرح جنبش کی۔ جیسے وہ مایوسی کا ایک بہت بڑا لقمہ نگلنے جا رہا ہو۔ پھر اُس نے آہستہ سے کاغذ کا ٹکڑا ثریا کی جانب بڑھا کر کہا۔

"لو کھاؤ۔"

"نہیں تم بھی کھاؤ۔ تم نے تو کچھ کھایا ہی نہیں۔" ثریا نے کہا۔

"نہیں پہلے تم کھالو۔ بعد میں جو بچے گا۔ وہ میں کھالوں گا۔" دانی نے اک عجیب ملائمت سے کہا۔

پہلے دن تو ثریا سب چٹ کر گئی۔ اس زور کی بھوک لگی تھی اُسے۔ دوسرے دن اُس نے کچھ تھوڑا سا چھوڑا دانی کے لئے پھر بھی وہ آہستہ آہستہ دانی کے لئے زیادہ کھانا چھوڑنے

گی۔ پھر بھی جو باقی بچتا تھا وہ دانی کے لیئے اس قدر کم ہوتا تھا کہ اس کی آدھی بھوک تشنہ ہی رہ جاتی تھی۔ لیکن اب اُس نے خالی پیٹ یا آدھے پیٹ رات کو بھوکے سو جانا سیکھ لیا تھا۔ پرانی عادت کو واپس بلانا اس قدر مشکل نہیں ہوتا۔ جس قدر نئی عادت کو پالنا۔ ہولے ہولے اُس نے شراب پینا چھوڑ دیا۔ کیونکہ بچے کو خوراک چاہیئے اور کپڑے بھی اور ثریا نے ابھی سے اپنے بچے کے کپڑے سینے شروع کر دیئے تھے۔ چھوٹے سے منے سے گڈے کے کپڑے۔ رنگدار اور ملائم اور ریشمی جن پر ہاتھ پھیرنے سے دانی کے جسم اور روح میں مسرت اور شادمانی کی پھریریاں سی گھومنے لگتی تھیں۔ "ہمیں زیادہ سے بچانا چاہیئے" کئی دنوں کی سوچ بچار کے بعد دانی اس نتیجے پر پہنچا۔

رات کے بارہ بجے تھے اور اب وہ دونوں فٹ پاتھ پر ایک دوسرے کے قریب لیٹے تھے۔ اور سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔

"مجھے اپنے بچپن اور لڑکپن میں کوئی دن ایسا یاد نہیں آتا۔ جس دن میں بھوکا نہیں رہا" دانی بولا۔

"میں کوئی رات ایسی یاد نہیں کر سکتی۔ جب میں کھانا چرانے کے الزام میں نہ پٹی ہوں" ثریا بولی۔

"مگر ہمارا بچہ بھوکا نہیں رہے گا" دانی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"اس کے پاس سب کچھ ہو گا" ثریا نے پُر امید لہجے میں کہا۔

"پیٹ بھرنے کے لیئے روٹی۔ تن ڈھکنے کے لیے کپڑا" دانی خوابناک لہجے میں بولا۔

"اور رہنے کے لیئے!" ثریا بولی۔

"گھر؟" دانی نے چونک کر پوچھا۔

"کیا اپنے بچے کو گھر نہ دو گے؟" ثریا نے شکایت کے لہجے میں پوچھا۔ "کیا وہ اسی فٹ پاتھ رہے گا؟"

"مگر گھر کیسے مل سکتا ہے؟" دانی نے پوچھا۔

"میں نے سب معلوم کر لیا ہے۔" ثریا نے سمجھایا۔ "چرچ کے پیچھے نُور امینشن بن رہی ہے۔ اس میں پانچ کمرے والے فلیٹ ہوں گے اور چار کمرے والے۔ اور تین کمرے والے اور دو کمرے والے اور دس فلیٹ ایک کمرے والے بھی ہوں گے جن کا کرایہ ستره روپے ہو گا اور پگڑی سات سو روپے۔"

"مگر سات سو روپے ہم کہاں سے دیں گے؟" دانی نے پوچھا۔

"اب تم کو سیٹھ تیس روپے دیتا ہے۔ مجھ کو پچیس روپے دیتا ہے۔ اگر ہم ہر مہینہ پچاس روپے نُور امینشن کے مالک کو دیں تو چودہ مہینے میں ایک کمرے کا فلیٹ ہم کو مل سکتا ہے۔"

بہت دیر تک دانی سوچتا رہا۔ ثریا کا ہات دانی کے ہات میں تھا۔ یکایک دانی کو ایسا معلوم ہوا جیسے ایک ہات میں ایک ننھے بچے کا ہات بھی آ گیا ہے۔ اُس کا دل عجیب طریقے سے پگھلنے لگا۔ گھلنے لگا۔ اُس کی آنکھوں میں خود بخود آنسو آ گئے۔ اور اُس نے اپنی بھیگی ہوئی آنکھیں ثریا کے ہات کی پُشت پر رکھ دیں۔ اور رندھے ہوئے گلے سے بولا۔

"ہاں۔ میرے بچے کا گھر ہو گا۔ ضرور ہو گا۔ میں سوچتا ہوں ثریا۔ میں تین گھنٹے کے لئے ڈوراگی کے چائے خانے میں رات کے گیارہ بجے سے دو بجے تک کام کر لوں۔ جب تو اپنا رستوران بھی بند ہو جاتا ہے۔ گیارہ بجے۔ پھر گیارہ بجے سے دو بجے تک چائے خانے میں کام کرنے میں کیا حرج ہے۔ وہ خانے کا سیٹھ دس روپے پگار دینے کو بولتا تھا۔ مگر میرے خیال میں وہ بارہ پندرہ روپے تک دے دے گا۔"

"جب تو ہم جلدی گھر لے سکیں گے۔" ثریا نے خوش ہو کر کہا۔

"اور اگر ایرانی سیٹھ اُدھار روپے دے تو شاید اپنے گھر پر ہی بچہ پیدا ہو گا۔" دانی کا چہرہ خوش آئیند امید کی روشنی چمکنے لگا۔ یکایک اس نے ثریا کا ہاتھ زور سے دبا کر کہا۔ "آؤ دعا کریں۔"

وہ دونوں اُٹھ کر گرجا کے آہنی جنگلے کو پکڑ کر دو زانو ہو گئے۔ جالی دار آہنی سلاخوں کے درمیان گرجا کے وسیع صحن کے وسط میں یسوع مسیح کا بُت صلیب پر آویزاں تھا۔ اور ایک طرف نیلے پتھروں کے گراٹو میں مریم نے مقدس بچے کو گود میں اُٹھا رکھا تھا۔ اور گراٹو میں مومی شمعیں روشن تھیں۔ اور گل مہر کی نازک پتیاں ہوا کے جھونکوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر چاروں طرف گر رہی تھیں اور مقدس مریم کی گود میں ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ جیسا بچہ ہر ماں کے تصوّر میں ہوتا ہے۔ اور یہ رات مریم کے لبادے کی طرح مہربان تھی۔ اور کسی نیند میں ڈوبے ہوئے یسوع کے خواب کی طرح معصوم......

دعا پڑھ کر دانی نے ثریا سے پوچھا۔

"یہ پادری آج بار بار اپنے وعظ میں آزادی۔ روٹی اور کلچر کی بات کر رہا تھا۔ آزادی اور روٹی تو خیر سمجھ میں آتی ہیں۔ مگر یہ کلچر کیا ہے؟"

"میرے خیال میں کوئی میٹھا کیک ہو گا۔" ثریا سوچ سوچ کے بولی۔

اور وہ دنیا میں امن کی بات بھی کرتا تھا! — دانی بولا۔ "مگر ہمیشہ تو میرے پیٹ میں ایسی جنگ ہوتی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ پیٹ کی جنگ کیسے بند ہو گی۔ او خدا کیسی بھیانک جنگ ہوتی ہے۔ میرے پیٹ میں...."

"میں جانتی ہوں۔ میری ماں بھی جانتی تھی۔ میری بہنیں بھی۔ میرے بھائی بھی اور ہم سب کا باپ بھی۔" ثریا تاسف انگیز لہجے میں بولی۔ "اور میرے باپ کا باپ بھی.... بے چارہ بڈھا

"...... کوئی رشتہ ہم سے اس قدر قریب نہیں رہا۔ جس قدر بھوک کا۔"

"خدا کرے ہمارا بیٹا بھوکا نہ رہے۔"

پیٹ میں امن، اور دُنیا میں امن۔ جیسا کہ وہ پادری کہتا تھا۔ آمین!

ایک دن ثُریا جس غیر متوقع طریقے سے آئی تھی۔ اُسی طرح سے وہاں سے چلی گئی۔ خبر سنتے ہی دانی بھاگا بھاگا رات کے ڈیڑھ بجے ڈوراگی کے چائے خانے سے اپنے فٹ پاتھ پر آیا تو اس نے دیکھا کہ لوگوں کا ایک اژدہام ہے اور پولیس کے بہت سے سپاہی سڑک پر اور فٹ پاتھ کے آس پاس کھڑے ہیں۔ اور ایک ٹرک فٹ پاتھ پر چڑھا ہوا ہے۔ اور اُس کا انجن گرجا کے آہنی جنگلے کو موڑتا ہوا گُل مہر کے پیڑ سے ٹکرا گیا ہے۔ پچھلے پہیوں پر ثریا اور علی اکبر کی لاشیں رکھی ہیں۔ کیونکہ یہی دو لوگ فٹ پاتھ پر سوئے ہوئے ٹرک کی زد میں آ گئے تھے۔ اگر دانی بھی سویا ہوتا۔ تو اس وقت اس کی لاش بھی یہیں پڑی ہوتی۔ کبھی کبھی رات کی تاریکی میں تیزی سے گزرتے ہوئے یا ایک دوسرے سے ریس کرتے ہوئے ٹرک فٹ پاتھ پر چڑھ جاتے ہیں۔ بڑے شہروں میں اکثر ایسا ہوتا رہتا ہے۔

دانی ایک احمق کی طرح خون میں لت پت ثریا کی لاش پر جھکا رہا۔ پھر وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے مجمع کی طرف دیکھنے لگا۔ اور کانپتے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔

"مگر ابھی تو وہ زندہ تھی۔

دو گھنٹے پہلے اُس نے اور میں نے اپنی جگہ پر کھانا کھایا تھا۔

وہ بالکل زندہ اور تندرست تھی۔

اُس کی عمر صرف سترہ سال تھی۔

اس کے پیٹ میں میرا بچہ تھا۔

چھ مہینے کا بچہ۔

میرا بچہ......

"کس نے مارا انہیں؟" یکایک دانی دونوں ہاتوں کی مٹھیاں کستے ہوئے زور سے چیخا۔

ایک تماشائی نے ٹرک کی طرف اشارہ کیا۔ فوراً پولیس کے دو سنتریوں نے دانی کو پکڑا مگر دانی نے گھونسے مار کر دونوں سنتریوں سے اپنے آپ کو آزاد کرا لیا۔ اس عرصے میں دونوں سنتری اس سے کشمکش کرتے ہوئے اسے ٹرک سے دور گھسیٹ کرلے گئے تھے۔ دانی ان سے آزاد ہو کر ٹرک کی طرف لپکا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں، بدن جھک گیا۔ اور پھر ایک مینڈھے کی طرح تن گیا۔ اس کے ہونٹوں سے جانور نما ایک بھنچی ہوئی سی غراہٹ نکلی۔ وہ اپنے سر کو ایک خوفناک طریقے سے آگے بڑھائے اور جھکائے تیزی سے ٹرک پر حملہ آور ہو گیا......

پورے چھ ماہ وہ ہسپتال میں رہا۔ کیونکہ اس کا سر کھل گیا تھا۔ وہ بچ تو گیا تھا مگر اس کے دماغ کا ایک حصہ تقریباً ناکارہ ہو چکا تھا۔ اور اب اس کا سر ایک پینڈولم کی طرح ہولے ہولے آپ ہی آپ ہلتا تھا۔ اور اس کا وحشی مینڈھے کی طرح پلا ہوا مضبوط جسم سوکھے ہوئے بانس کی طرح دبلا ہو گیا تھا۔ اور اسے سب کچھ یاد تھا۔ اور بہت کچھ یاد بھی نہیں تھا۔ اور اب، وہ کوئی کام نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اگر گاہک اس سے چائے مانگتا تو وہ اس کے سامنے پانی لا کر رکھ دیتا۔ اور اگر کوئی آملیٹ مانگتا تو وہ اس کے سامنے ماچس کی ڈبیا رکھ دیتا۔ اس لئے ایرانی ریستوران کے مالک نے مجبور ہو کر اسے ملازمت سے الگ کر دیا تھا۔ مگر وہ ابھی تک فٹ پاتھ پر اس جگہ سوتا تھا جہاں ثریا سوتی تھی۔ اور اس نے اپنے بچے کے کپڑے گرجا کے آہنی جنگلے کے کونے میں چھپا کر رکھ دیے تھے اور رات کے سناٹے میں وہ اکثر انہیں نکال

کر بجلی کے کھمبے کے نیچے بیٹھ کر تکا کرتا تھا۔ اور فٹ پاتھ پر حجامت کرنے والا رامو نائی اُکثر اس سے پوچھتا۔

"یہ کس کے کپڑے ہیں؟"

"میرے بچے کے ہیں۔"

"تیرا بچہ کہاں ہے!" تھاگوین کے چائے خانے کا قاسم اُس سے پوچھتا۔

"وہ میری ثریا کے پاس ہے۔"

"تیری ثریا کہاں ہے؟"

"وہ میکے گئی ہے۔"

"وہاں سے کب لوٹے گی؟" گوپی جیب کترا اُس سے پوچھتا۔

"جب میرا گھر بن جائے گا۔" دانی انتہائی معصومیت سے جواب دیتا۔

یہ جواب سُن کر مذاق کرنے والے کے چہرے فق ہو جاتے اور وہ وہیں بیٹھے بیٹھے خلاؤں میں تکنے لگتے۔ جیسے دُور سے کسی ٹرک کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھ رہے ہوں۔ اور ہل نہ سکتے ہوں۔ فٹ پاتھ پر رہنے والے۔ اپنی مجبوری سمجھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ فٹ پاتھ سے اپنا بستر تو تہہ کر سکتے ہیں۔ لیکن فٹ پاتھ کو تہہ نہیں کر سکتے۔ ابھی تک کوئی ایسا طریقہ ایجاد نہیں ہوا ہے۔ اس لئے انہیں دانی کے گھر کا تخیل ایک بہت بڑا مذاق معلوم ہوا۔

دُوسرے دن دانی بڑے انہماک سے اپنا گھر بنانے میں مصروف نظر آتا۔ کہیں سے وہ تین اینٹیں اُٹھا لایا تھا۔ اور اب وہ ایک اینٹ پر دوسری اینٹ رکھ کر اُس پر تیسری اینٹ لگانے میں مصروف تھا کہ قاسم نے اس سے پوچھا۔

"دانی! یہ کتنا بڑا گھر ہو گا؟"

دانی کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

"یہ ایک بہت بڑا گھر ہوگا۔" وہ بولا۔" اور میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اسے چارک روڈ کے عین بیچ میں تعمیر کروں گا۔ اس کے دس مالے ہوں گے۔ ہر مالے میں بتیس فلیٹ ہوں گے۔ ہر فلیٹ میں تین کمرے ہوں گے۔"

"تین کمرے کس کے لئے؟" گوپی جیب کترے نے پوچھا۔

"ایک میاں کے لئے۔ ایک بیوی کے لئے۔ ایک بچے کے لئے۔"

"مجھے بھی اس گھر میں جگہ دو گے؟" رامو حجام نے پوچھا۔ میری بیوی، میرے دو بچے ہیں۔ اور وہ تینوں میرے گاؤں میں ہیں۔ کیونکہ یہاں میرے پاس کوئی گھر نہیں ہے اور میری ماں بوڑھی ہے۔" گوپی بولا۔" اور میرے پاس کوئی کام نہیں ہے۔ سوائے جیب کاٹنے کے۔ اور میں تین دفعہ جیل کاٹ چکا ہوں۔ اور مجھے تم اپنے گھر کا چوکیدار رکھ لینا۔ اور رہنے کے لئے صرف ایک کمرہ دے دینا۔"

"یہ ایک بہت بڑا گھر ہوگا۔" دانی انتہائی خلوص سے بولا۔ اور شدت جذبات سے اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں باہر نکلی پڑتی تھیں۔" اور اس میں تم سب کے لئے جگہ ہوگی۔ قاسم کے لئے اور رامو کے لئے اور گوپی کے لئے اور دھیرج کے لئے اور والنسٹ کے لئے اور پاٹل کے لئے اور رنگا چاری کے لئے اور تھا گولین اور ڈورا گی کے فٹ پاتھ سونے والوں کے لئے بھی جگہ ہوگی۔ میرا خیال ہے۔ میں اسے بیس مالے کا بناؤں گا۔ ہر مالے میں تیس فلیٹ ہوں گے۔ ہر فلیٹ میں چار کمرے ہوں گے۔ ہر کمرے کے ساتھ باتھ روم ہوگا۔ فلش اور شاور.....

"موزیک کا فرش۔" قاسم بولا.....

"اور کھڑکیاں سمندر کی طرف کھلتی ہوئیں" گوپی نے لقمہ دیا۔

یکایک ایک لمحے کے لئے ان سب نے باور کر لیا۔ یقین کر لیا۔ ایک لمحے کے لئے انہوں نے چارک روڈ کے چوک پر اس بڑے گھر کو تعمیر ہوتے ہوئے۔ بلند ہوتے ہوئے۔ آسمان سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ دوسرے لمحے میں ایک بہت بڑا ٹرک گھوں گھوں کرتا ہوا ان کے قریب سے گزر گیا اور وہ سہم کر چپ ہو گئے۔

اُس کے بعد کئی ماہ تک دانی وہ گھر بناتا رہا۔ اینٹیں تو اس کے پاس وہی تین تھیں۔ مگر گھر کا نقشہ ہر روز بدلتا تھا۔ وہ اب پچاس منزل کا ایک محل تھا۔ جس میں صرف فٹ پاتھ پر رہنے والے داخل ہو سکتے تھے۔ اس محل میں زندگی کی ہر سہولت اور آسائش مہیا تھی۔ بجلی کی لفٹ۔ اور ٹیلیفون۔ ایک چھوٹا سا سینما اور نرسری سکول۔ اور چھت پر خوبصورت پھول والا گارڈن۔ دیوار گیر روشنیاں اور مدھم مدھم رنگوں والے غالیچے اور خوبصورت تتلیوں کی طرح آہستہ خرم عورتیں اور بچے۔ اور دھیمے دھیمے بجتے ہوئے ارغنون اور مہذب مرد مسکراتے ہوئے سگریٹ پیتے ہوئے ایک دوسرے سے جام ٹکراتے ہوئے اور ان کے کپڑے بھی عمدہ اور خوشبودار اور جیبیں سکوں سے بھری ہوئی اور وہ سب کچھ جو غریب لوگ سینما میں دیکھتے ہیں اور امیر اپنے گھر پر رکھتے ہیں۔ وہ سب کچھ اس گھر میں موجود تھا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ بلند۔ خوبصورت۔ درخشاں۔ عالیشان۔ وہ گھر اتنا ہی خوبصورت تھا۔ جتنا کسی بے گھر کا تخیل ہو سکتا ہے۔

اور پھر جب کئی ماہ کی کاوش کے بعد وہ گھر مکمل ہو گیا تو رات کے گیارہ بجے سے ایک بجے تک دانی ٹین کا ایک ڈبہ پیٹتے ہوئے چارک روڈ کے دونوں فٹ پاتھ اور تھوگالین کے فٹ پاتھ اور ڈوراگلی بلکہ کراس بازار اور چارک پارک کے فٹ پاتھیوں کو اس نئے گھر

میں آنے کی دعوت دیتا پھرا۔ ظاہر ہے اس کے پاس وہی تین اینٹیں تھیں۔ مگر اب اس نے ان تین اینٹوں کو چارک چوک کے ٹریفک آئی لینڈ کے اندر رکھ دیا تھا۔ اور اس طرح اپنا محل تعمیر کر لیا تھا اور اب وہ سارے فٹ پاتھیوں کو اپنے بیوی بچوں سمیت گھر میں آنے کی دعوت دے رہا تھا۔

ڈورانگی کے پاٹل نے روک کر کہا "لیکن میرے تو سات بچے ہیں۔ اور ہم سب کے سب اس کھلے فٹ پاتھ پر بڑے آرام سے سوتے ہیں۔ تمہارے تین کمروں والے فلیٹ سے ہمارا کیا ہوگا۔"

"میں تمہیں سات کمروں والا فلیٹ دوں گا۔" دانی نے ٹین پیٹتے ہوئے چلا کر کہا۔

"کب آئیں ہم لوگ؟" پاٹل کی بیوی نے اپنی مسکراہٹ کو ساڑھی کے پلّو میں چھپا کر اس سے پوچھا۔ اس کی ہنسی رکی نہیں پڑتی تھی۔

"کل صبح جب ثریا بچے کو لے کر میکے سے آ جائے گی۔ میں اپنے گھر کے دروازے سب لوگوں کے لئے کھول دوں گا۔ دروازے پر بینڈ ہوگا۔ رنگا رنگ جھنڈیاں ہوں گی اور بندھن وار یں اور میں پادری کو گھر کے مہورت کے لئے بلاؤں گا اور وہ بائبل سنائے گا۔ اور گرجا کے گھنٹے بجیں گے اور اس وقت تم سب لوگ میرے گھر میں داخل ہوگے۔"

دانی کی کانپتی ہوئی آواز میں انتہائی خلوص تھا۔ اس کا دُبلا چہرہ زرد رُو اور بخار زدہ دکھائی دیتا تھا۔ اس کی آنکھیں سُرخ اور بے چین تھیں۔ اور متواتر چلانے سے اس کے ہونٹوں پر کف آ چلا تھا۔ اور اس کے سوکھے بالوں کی لٹوں میں فٹ پاتھ کی خاک چمک رہی تھی۔

دوسرے دن دانی بلوگراٹو کے باہر مقدس مریم کے قدموں میں مردہ پایا گیا۔ اس کی

آنکھیں کھُلی تھیں اور نیلے آسمان میں کسی نامکمل سپنے کو تک رہی تھیں۔ اُس کے کپڑے پھٹے چیتھڑے اور تار تار تھے۔ اور اس کے سینے پر وہی تین اینٹیں رکھی تھیں۔ اور اُس نے مقدس مریم کے قدموں کے فرش پر اپنا سر مار مار کر توڑ دیا تھا۔

....

....

گرجا کھول دو۔

اور گھنٹے بجاؤ۔

دیکھو یسوع مسیح جا رہا ہے۔

اپنے سینے پر اینٹوں کی صلیب لئے ہوئے۔

اب جنت کے دروازے غریبوں کے لئے کھُل گئے ہیں۔

کیونکہ ایک اونٹ سوئی کے ناکے سے نہیں گزر سکتا۔ لیکن ایک امیر قانون کے ہر ناکے سے گزر سکتا ہے۔

اور اب اس دھرتی کے مالک غریب ہوں گے۔

اور غریبوں کے مالک امیر ہوں گے۔

دیکھو وہ یسوع مسیح جا رہا ہے۔

آؤ اُسے سنگسار کریں۔

قلمی کارٹون

سلمیٰ صدیقی

جب کہیں کرشن چندر کے فن کی تعریف یا ان کے ادب پر بحث یا ان کے فن کے عمیق سمندر سے موتی کھوجنے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ تو میں الجھن میں پڑ جاتی ہوں۔ اور سوچتی ہوں کہ کرشن چندر یا تو بہت قابل انسان ہیں یا بے حد جاہل، جو ہر دن کی زندگی میں معمولی سی، معمولی سوجھ بوجھ بھی نہ رکھتے ہوئے اپنے پیارے قارئین کے سامنے عظیم مصنف کا روپ اختیار کئے ہوئے پوری دنیا کو بیوقوف بنا رہے ہیں

اب آپ خود ہی سوچئے، جو خود ہی کارٹون ہو، اس کا کارٹون کیسے پیش کروں۔؟

کرشن چندر کی کچھ بے حد بچگانہ باتیں، جن کو آپ سوچ بھی نہ سکیں گے، گھر والوں کے لئے آئے دن کا دستور بن چکی ہیں۔ اور ان کے ساتھ رہتے رہتے اور ان کی ناسمجھی کی باتیں سنتے سنتے کبھی کبھی مجھے یہ ڈر بھی لگنے لگتا ہے کہ کہیں میں خود بھی ایسی ہی معمولی ادیب

نہ بن جاؤں جیسے کہ کرشن چندر ہیں۔

جو لوگ سمجھتے ہیں کہ کرشن چندر کو لکھنے پڑھنے سے بہت دلچسپی ہوگی اور ان کا زیادہ تر وقت ادب و فن پر صرف ہوتا ہوگا۔ ان کو میرا مشورہ ہے کہ وہ کچھ دن کرشن چندر کے ساتھ رہیں۔ تبھی ان کو پتہ چل سکے گا کہ اس عظیم اور شہرۂ آفاق مصنف کا زیادہ تر وقت لکھنے پڑھنے میں نہیں، بلکہ صرف کھانسنے، تھوکنے، یا اپنی عینک تلاش کرنے میں صرف ہوتا ہے — عام طور پر بیماری یا مجبوری کے موقع پر کھانسا جاتا ہے، مگر کرشن چندر اپنے دل کو بہلانے، ذوق کی تسکین، اطمینان بخش وقت گزارنے کے لئے کھانستے ہیں۔

وہ اپنی کہانی کی طرح اپنی کھانسی میں بھی نت نئے تجربے فرماتے ہیں! یعنی — کھانستے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں!

کرشن چندر ایشیا کے عظیم مصنف ہیں یا نہیں، یہ سوچنے کی بات ہے۔ لیکن یہ بات دعوے سے کہی جا سکتی ہے کہ کرشن چندر صرف کھانستے ہی نہیں، کبھی کبھی "چھینکتے" بھی ہیں۔ اور جب ان پر زکام کا حملہ ہوتا ہے، تو کھانسی اور چھینکیں مل کر ایک بڑے سہاؤنے آرکسٹرا کی فضا پیدا کر دیتی ہیں۔ اس وقت کرشن چندر کے چاروں طرف رومالوں کا ڈھیر لگا ہوتا ہے۔ کرشن چندر زکام کے دوران میں اپنے ان گنت رومالوں کے ڈھیر میں اس طرح گھر جاتے ہیں کہ کسی نئے آدمی کے لئے پتہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ کرشن چندر کہاں ہیں اور رومال کون ہے —؟

کھانسنے کے بعد کے نتیجے کو وہ بڑے فخر اور غرور سے اپنے صاف ستھرے رومال کی تہوں میں بڑی ہوشیاری سے سنبھال کر کسی عشقیہ خط کی طرح اپنی جیب میں محفوظ کر لیتے ہیں —!

کرشن چندر کا یہ زکام صرف ایک بہانہ ہوتا ہے۔ خدمت کروانے اور زیادہ سے زیادہ کھانے کا۔ اپنی بات منوانے کے لئے، وہ بار بار کہتے جاتے ہیں —

فیڈ دی کولڈ اینڈ اسٹار و دی فیور،

اور یہ بات وہ کچھ اس طرح سے کہتے ہیں جیسے کھانے پینے کی تو انہیں بالکل پروا نہیں ہے۔ صرف اپنے زکام کو کھلانے پلانے کی فکر ہے۔ پھر اٹھتے اٹھتے کراہتے ہیں اور کھاتے ہیں۔ کراہ کراہ کر کھانستے ہیں اور کھانس کھانس کر کراہتے ہیں۔

کرشن چندر کھانے کے معاملے میں کسی کی نہیں سنتے۔ یوں وہ سنتے تو کسی معاملے میں بھی نہیں ہیں۔ لیکن کھانے پینے کے معاملے میں تو وہ بالکل ہی کان بند کر لیتے ہیں۔ ہاں، منہ ضرور کھول لیتے ہیں۔ ضروری سے ضروری کام اور بڑی سے بڑی اُلجھن سامنے کیوں نہ ہو۔ جب ان کو بھوک لگتی ہے، اور وہ تو لگی رہتی ہے، تو وہ کسی کے بس میں نہیں ہوتے ہیں۔ اس وقت تو ان کا پیارا مادّی انقلاب بھی اگر دروازے کو کھٹکھٹائے تو اُسے بھی مایوس لوٹنا پڑے گا۔ کیونکہ اسوقت کرشن چندر دنیا کی سدھ بدھ کھو کر کھانے کی میز پر سر جھکائے پھل کاٹ کاٹ کر کھانے میں مشغول ہوں گے۔

کرشن چندر کھانے کے بعد کرسی سے فوراً ہی نہیں اُٹھ پاتے ہیں۔ تھوڑی دیر سستاتے ہیں۔ پھر کھڑے ہو کر کسی بوجھ اٹھانے والے مزدور کی طرح ہانپتے ہیں۔ دو قدم چل کر دیوان پر لیٹ جاتے ہیں، اور پھر کھانے کی میز کی طرف یوں تاکتے ہیں کہ —

گو ہاتھ میں جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے!!

ایک زمانے میں کرشن چندر کو ڈاکٹروں اور دوستوں نے بتایا کہ ان کا وزن بڑھ رہا

ہے۔ اس لیئے کھانے پینے میں پرہیز کرنے کے علاوہ انہیں کچھ دیر کھلی ہوا میں گھومنا بھی چاہیئے۔ گھر کے سامنے لانبا، سیدھا کھُلا ہوا میدان گھومنے اور سیر کرنے کے لیئے بہت نایاب جگہ ہے۔ اور کرشن چندر بڑی نیک نیتی سے اس سنسان میدان میں ٹہلنا بھی چاہتے تھے، مگر نہ جانے کیسے انجانے میں اُن کے قدم گھر کے پیچھے کی اس چہل پہل اور ٹریفک سے بھرپور سڑک پر جا پہنچتے تھے جہاں ٹہلنے اور گھومنے کے علاوہ سب کچھ ممکن تھا۔ اور جہاں بھیل پوری کھٹی میٹھی چاٹ، آئس کریم اور قلفی کا بازار گرم ہوتا تھا۔

ویسے کرشن چندر سے زیادہ واقفیت رکھنے والوں کا خیال یہ بھی تھا کہ وہاں کھانے پینے والوں کا جمگھٹ بھی کرشن چندر کے لیئے دلچسپی کا باعث ہوا کرتا تھا۔

عام طور پر کرشن چندر جب گھر میں داخل ہوتے ہیں، اُن کے منہ پر پریشانی اور ہاتھ میں پھل ہوتے ہیں۔ پھلوں کے وہ عاشق ہیں اور پریشانیاں ان کی عاشق ہیں۔ جو لوگ کرشن چندر کی پریشانیاں دور کرنا چاہتے ہیں، وہ خود نت نئی پریشانیوں میں گھر جاتے ہیں۔ اور کرشن چندر کے جن چاہنے والوں نے ان کی پریشانیوں میں اضافہ کیا ہے، وہ خاص طور سے بڑے خوش وخرم رہتے ہیں۔ اور کرشن چندر کے اتنے ہی قریب بھی ہوتے ہیں۔

کرشن چندر کا جو وقت کھانے پینے سے بچ رہتا ہے، وہ عام طور سے اپنی عینک کھوجنے میں گزرتا ہے۔ اُن کی عینک کا کچھ عجیب سلوک ہے۔ وہ کبھی وہاں نہیں پائی جاتی، جہاں اسے ہونا چاہیئے۔ شروع شروع میں جب مجھے کرشن چندر کی عینک کھوجنی پڑتی تھی، تو میں اصولی طور پر کرشن چندر کی میز پر، الماری میں، بک شیلف پر، یا ان کی جیبوں میں عینک کھوجتی تھی۔ لیکن کچھ ہی دنوں میں مجھے پتہ چل گیا کہ عینک بھی اپنے مالک کی طرح ایک جگہ پر ٹکنے پر مجبور نہیں کی جا سکتی۔ لہٰذا آج کل جب ان کی عینک کھو جاتی ہے تو میں فوراً ہی فرج

کھول کر دیکھتی ہوں۔ عینک اگر وہاں نہیں ملتی تو میں سمجھ جاتی ہوں کہ اب عینک حرف کھانے کی میز پر یا پھلوں کی دوکان میں ملے گی۔

ہم فلمیں بہت کم دیکھتے ہیں۔ اور ایک بار کرشن چندر کے ساتھ ایک فلم دیکھنے کے بعد تو اس خوش گوار تفریح سے بالکل توبہ کر لی ہے۔ آٹھ دس مہینے کے بعد ایک بار ہم لوگ ایک فلم دیکھنے ایک پکچر ہاؤس میں پہنچے۔ سُنا تھا کہ تصویر بہت اچھی ہے۔ بھیڑ بہت زیادہ تھی۔ کیو بہت لمبی تھی، اور کرشن چندر جلد سے جلد ٹکٹ خرید لینا چاہتے تھے۔ کسی نے کہا کہ ہاؤس فل کی تختی لگ گئی ہے۔ اُسی وقت ایک آدمی نے ہمارے پاس آکر نہایت دھیرے سے کہا۔ بلیک ادھر ہوتا ہے!—

کرشن چندر نے مڑ کر اس آدمی کو دیکھا، پھر آگے بڑھ کر کیو میں کھڑے ہوئے سب لوگوں سے کہنے لگے — "چلئے چلئے، بلیک اُدھر ہوتا ہے —" لیکن جب مڑ کر ہم نے دیکھا تو وہ، بلیک کی خبر دینے والا آدمی کہیں کھو چکا تھا۔

کرشن چندر کو پھل کھانے کے ساتھ ساتھ پھلوں کا رس پینے کا بھی شوق ہے۔ اب یہ بات دوسری ہے کہ وہ باسی رس پینا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ کبھی کبھی رات جب ٹھٹھری ہوئی دھرتی کو اپنی چاندنی کی باہنوں میں سمیٹ لیتی ہے، اور مزدوروں کی اور کسانوں کی اور محنت کشوں کی اور دولت والوں کی آتما کو اپنے مدھر اور پُرسکون اور بے درد اور بے نور، اور بے شعور اور لامحدود مدھر راگنی کو چھیڑتی ہے، اور جب کشمیر کی گھاٹیوں کی گود میں بہنے والا سیال مادہ دھیرے دھیرے اٹکھیلیاں کرتا حاجی پیر پنجال کی چوٹیوں کا پُرکشش منظر سمیٹتا ہوا حاجی پیر درّے سے ہوتا ہوا اور، بہت دور آسمان کے اُس پار مچھیرے کے جال کی طرح پھیلنے لگتا ہے، اور ستارے کانپنے لگتے ہیں، اور اس وقت جب کوئی آگی، نوراں، ریشماں، نور افشاں

یا وتی اپنی بھیڑوں کے جھنڈوں کو چراگاہ سے واپس لے آتی ہیں، تو اس وقت کرشن چندر بھی اپنا باسی شربت کا گلاس سنبھال سنبھال لیتے ہیں، اور اپنے کسی مخلص دوست اور پیارے اور رازدار ساتھی کے ساتھ بیٹھ جاتے ہیں، اور جوں جوں وقت گذرتا جاتا ہے، کرشن چندر کا چہرہ گلستان ہوتا جاتا ہے، اور ان کا چہرہ کسی انجانی خوشی کی روشنی سے چمکنے لگتا ہے۔ اور وہ بار بار بلا سبب آستینیں چڑھانے اتارنے لگتے ہیں۔ اور آس پاس کے لوگوں سے کہتے جاتے ہیں ــــ!

"ارے بھائی، لڑو مت! ارے بھائی جھگڑو مت!"

کچھ اور وقت گزرنے پر وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر کہتے ہیں:"

"میں بالکل ٹھیک ہوں!"

یہ سگنل ہوتا ہے اس خطرے کا جس کا مطلب ہے ــ میں بالکل ٹھیک نہیں ہوں۔

لکھتے وقت کرشن چندر آزادی کا صحیح مصرف لیتے ہیں۔ اکیلے کمرے میں بیٹھ کر لکھتے ہیں اور کمرہ اندر سے بند کر کے لکھتے ہیں۔ ایک بار چوری چھپے میں نے ان کے کمرے میں جھانک کر دیکھا، تو کیا دیکھا کہ وہ سب کچھ بھولے ہوئے اپنے لکھنے کے پیڈ پر جھکے ہوئے تھے۔ کرشن چندر کا چہرہ اس وقت مجھے بڑا ہی ظالم، بھیانک اور اجنبی سا دکھائی دیا۔ ان کی تیوریوں پر بل تھے۔ ہونٹ بھینچے ہوئے تھے، اور قلم ان کے ہاتھوں میں خنجر کی طرح نظر آ رہا تھا۔ کیسا بھیانک اور مجرم تھا وہ! میں تو کسی ایسے چہرے کو جانتی نہ تھی۔ گھبرا کر میں وہاں سے بھاگ آئی ــــ

کچھ دیر کے بعد کرشن چندر کھانستے ہوئے اپنے کمرے سے باہر نکلے اور سیدھے کھانے کی میز کی طرف آئے۔ اس وقت ان کا چہرہ پھر سے ان کا اپنا چہرہ بن چکا تھا، پُرسکون، گمبھیر، رحم دل اور بے حد معصوم چہرہ!

میں نے کچھ دیر پہلے کا واقعہ سُنایا۔ تو کرشن چندر چپ رہے، پھر ہنسنے لگے، اور آخر میں انہوں نے اپنا رائٹنگ پیڈ لاکر مجھے تھما دیا۔ وہ ان کی کہانی، آدھے گھنٹے کا خدا، کا آخری حصہ تھا جس میں ایک سپاہی اپنی جاسوس محبوبہ کو محبت کے آخری [illegible] قتل کر دیتا ہے۔ اور اس وقت کرشن چندر کے چہرے پر جو بے رحمی مجھے دکھائی دی تھی وہ اس بس رہے ہوئے عاشق کی بے رحمی تھی۔

اس واقعہ کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا کہ کبھی چھُپ کر اُن کو لکھتے وقت نہیں دیکھوں گی ــــ مگر پھر ایک زمانے میں چھُپ کر کرشن چندر کو لکھتے ہوئے دیکھنے کو میرا جی کئی بار چاہا تھا۔ یعنی جب وہ "ایک گدھے کی سرگزشت" لکھ رہے تھے۔

اشاریہ

(۱) عورت اور کھانا

"یار تم نے کبھی اس عورتوں کے ہوٹل میں کھانا کھایا؟"

"ہاں۔"

"کیسا ہوتا ہے؟"

"پہلی بات تو یہ ہے کہ عورتوں کے ہات کا پکایا ہوا نہیں ہوتا۔ دوسری بات تو یہ ہے کہ پھیکا ہوتا ہے۔ اور میں ذرا مزے دار چٹ پٹا مصالحے دار کھانے کے حق میں ہوں تیسری بات یہ ہے کہ گو اس وقت تو پیٹ بھر جاتا ہے۔ مگر بعد میں تھوڑی دیر کے بعد پھر بھوک چمک اُٹھتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کچھ کھایا ہی نہیں۔ جیسے کسی نے بھوک سے دھوکہ کیا ہے!!"

"گھر"۔ سطر ۱۵، صفحہ ۲۴

(۲) گھر! پیارا گھر!! ——————

ہے بھگوان۔ مجھے ایک چھوٹا سا گھر دے دو نا۔ ایک ننھا منا گھر، بالکل اتنا چھوٹا سا جتنی دور تک میرے بازو پھیل سکتے ہیں۔

"گھر"۔ سطر ۱۸، صفحہ ۲۷

(۳) تاش کا کھیل ——————

"اور یوں غور سے دیکھا جائے تو زندگی کی بازی بھی ایک طرح سے تاش کا کھیل ہے۔ اس میں کبھی ہار ہے کبھی جیت ہے۔ کبھی پتے اچھے آتے ہیں، کبھی برے آتے ہیں۔ کبھی پارٹنر سے جھگڑا ہوتا ہے۔ صلح صفائی بھی ہوتی ہے۔ حساب کتاب بھی ہوتا ہے۔ اس طرح پتے کھیلتے کھیلتے ہم بھول جاتے ہیں کہ ان پتوں سے باہر بھی کوئی دنیا ہے۔ جہاں گلاب کھلے ہیں۔

کنواری۔ سطر ۱۲، صفحہ ۳۴

(۴) ہار جیت ——————

"تاش کا کھیل کسی کے لئے زیادہ دیر تک رک نہیں سکتا۔ پھر وہ وقت بھی آئے گا جب زندگی کی ساری تاش سمیٹ کر الگ رکھ دی جائے گی۔ تمہاری قسمت کا بادشاہ اور یکہ اور بیگم اور غلام سب دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ اور تم اس تاش میں سے ایک پتا نہ نکال سکو گے۔ کسی کو پارٹنر نہ کہہ سکو گے۔ تمہاری بازی ختم ہوئی اور بس اتنی ہی بازی تھی۔ اپنا پتا جلدی سے چلو۔"

کنواری۔ سطر ۲، صفحہ ۳۵

(۵) تاش کا دوسرا رخ ——————

"زندگی کی تاش کس قدر آسان ہوتی۔ اگر دوسرے کھیلنے والے نہ ہوتے۔"

کنواری۔ سطر ۲، صفحہ ۳۶

(۶) مردمار اور پچھتاوہ ——————

"اور کبھی کبھی مرد پیٹے تو بڑا مزہ آتا ہے؟ پام نے میگی کو سرگوشی میں بتایا۔" کیونکہ اس کے

بعد مرد پر پچھتاوے کا ایک شدید دورہ پڑتا ہے۔ اس میں وہ عورت کو بڑی شدت سے منانے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس دورے میں بڑی حماقتیں کرتا ہے۔ روتا ہے۔ ہاتھ جوڑتا ہے۔ پاؤں پڑتا ہے۔ کبھی کبھی اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر نیا فراک تک سلوا دیتا ہے۔"

کنواری۔ سطر۱، صفحہ ۳۹

(۷) شوہر اور بڑھاپا ــــــــــــــ

"شوہر رکھنا عمدہ چیز ہے۔ مگر آہ! اب تو بڑھاپا آگیا ہے!!!"

کنواری۔ سطر۱، صفحہ ۳۹

(۸) عورت؟ ــــــــــــــ

"اور پام تو بالکل گرم پانی کی بھری ہوئی ربڑ کی بوتل کی طرح آرام دہ معلوم ہوتی ہے۔"

کنواری۔ سطر۱۹، صفحہ ۴۰

(۹) سماج ــــــــــــــ

مگر یہ تو ایک عجیب و غریب نامعقول ٹیڑھا سماج ہے۔ یہاں ہر خوبی خامی ہے۔ یہاں اگر آپ سیدھے سچے اور کھرے ہیں تو آپ کی قیمت دس روپے کے نوٹ سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر آپ کی ڈی (D) الٹی اور ای (E) غائب ہے تو آپ کی قیمت تیس ہزار بھی ہو سکتی ہے۔

دس روپے کا نوٹ۔ سطر۵، صفحہ ۵۶

(۱۰) شباب ــــــــــــــ

رسنا اس کا نام تھا۔ شباب کا رس اس کی رگوں میں دوڑتا نہیں تھا۔ کھولتا تھا۔ وہ ایک تند و تیز لاوے کی بنی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے جسم میں بپھرے ہوئے سمندر کی لہروں

کا خرام تھا۔ اس کی نگاہوں میں بجلی کا کوندا تھا۔ اور انگلیوں میں آگ کی لپٹ۔

دس روپے کا نوٹ۔ سطر ۶، صفحہ ۵۹

(۱۱) جذبے ____________

پانی بہتے ہوئے جذبوں کی طرح اس کے بدن پر سے گزر رہا تھا۔

دس روپے کا نوٹ۔ سطر ۱۱، صفحہ ۶۸

(۱۲) خاندان اور حکومت ____________

جانتے ہو ہمارا خاندان ہندوستان کے پہلے تیس خاندانوں میں سے ہے دولت اور طاقت کے اعتبار سے یہی تیس خاندان ہندوستان پر حکومت کرتے ہیں۔

دس روپے کا نوٹ۔ سطر ۱۳، صفحہ ۷۶

(۱۳) اخلاقی اصول ____________

اخلاق کے ایسے کھوکھلے اصول اسٹیج پر اور مذہبی کتابوں میں بڑے اعلیٰ معلوم ہوتے ہیں مگر زندگی میں ان کا کیا کام؟

دس روپے کا نوٹ۔ سطر ۲، صفحہ ۷۷

(۱۴) مسکراہٹ ____________

وہ جب ہنستی تھی تو ایسا لگتا تھا گویا سیب کی ڈالیوں سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ ایسی مہکتی ہوئی سپید ہنسی اُس نے کسی دوسری لڑکی کے پاس نہ دیکھی تھی۔

آدھے گھنٹے کا خدا۔ سطر ۱، صفحہ ۹۴

(۱۵) ہونٹ ____________

اور وہ ذرا سے کھلے ذرا سے بند انگاروں کی طرح دہکتے ہوئے شریر ہونٹ۔ ان ہونٹوں پر جب وہ اپنے ہونٹ رکھ دیتا تھا تو اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے خون کے بہاؤ

ہیں چنگاریاں سی اُڑتی چلی جا رہی ہیں ۔ جیسے جذبہ گھل کر خون اور خون پگھل کر شعلہ اور شعلہ پگھل کر بوسہ بن گیا ہو ۔ آدھے گھنٹے کا خدا ۔ سطر ۴ ، صفحہ ۹۴

(۱۶) جنگل کا راز

یہاں آکر وہ کئی منٹ تک جنگل کے گہرے سناٹے میں کھو جاتے ۔ اور آہستہ آہستہ سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگ جاتے ۔ کبھی ایسا لگتا جیسے سارا جنگل چپ ہے ۔ کبھی ایسا لگتا جیسے سارا جنگل ان کے ارد گرد سرگوشیوں میں باتیں کر رہا ہے ۔

آدھے گھنٹے کا خدا ۔ سطر ، صفحہ :

(۱۷) بوسے

خوبصورت اور پُرخطر زندگی بسر کرنے والی عورت کی زندگی میں بہت سے بوسے آتے ہیں ۔ دیمک کی طرح چاٹ جانے والے بوسے ۔ اور جونک کی طرح چمٹ جانے والے بوسے ۔ روکھے سوکھے پاپڑ نما بوسے ۔ اور ایسے لجلجے اور گندے بوسے گویا ہونٹوں پر کیڑے چل رہے ہوں ۔ شرمائے ہوئے سہمے ہوئے بوسے ۔ اور خوف زدہ ۔ کمزور اور بیمار بوسے اور صحت مند اور شریر بوسے ۔" آدھے گھنٹے کا خدا ۔ سطر ۱۵ ، صفحہ ۹۸

(۱۸) بوسے کا جواب

خوب صورت عورتوں کو ہر قسم کے بوسوں سے واسطہ پڑتا ہے ۔ مگر وہ یہ بھی جانتی ہیں کہ اُن میں سے کون سا بوسہ ایسا ہوتا ہے جو دل پر دستک دیتا ہے ۔ صرف اسی دستک کے جواب میں وہ بوسے کے جواب میں بوسہ دیتی ہیں ۔ ورنہ صرف ہونٹ پیش کرتی ہیں ۔

آدھے گھنٹے کا خدا ۔ سطر ۱ ، صفحہ ۹۹

(۱۹) آنکھیں

یہ اچھا ہے کہ میں اُس کی آنکھیں نہیں دیکھ سکتا۔ شاید میں ان آنکھوں کے اندر کبھی نہ جھانک سکتا۔ اتنی ہمت مجھ میں نہ ہوتی وہ آنکھیں نہ جانے مجھ سے کوئی سوال کر بیٹھتیں تو میں انہیں کیا جواب دیتا۔ کیونکہ ان میں سوال اس طرح سامنے نہیں آتے۔ دن میں آدمی کام کرتا ہے۔ اور اکثر محسوس نہیں کرتا۔ اور اگر کرتا بھی ہے تو اپنے کام میں اتنا مصروف ہوتا ہے کہ اپنے جذبات و حسیات کو ابھرنے کا موقع نہیں دیتا۔ لیکن جب رات ہوتی ہے تو یہ جذبات خُود بخود اُمڈ کر باہر آجاتے ہیں اور پھر رات کو بمبئی کی مہیب اور تاریک دیواریں بلگجی روشنی میں ٹھٹھرے ہوئے پورچ اور آسمان کی طرف تکتے ہوئے خاموش گنبد درد منعف ایسے عجیب و غریب سوال پوچھتے ہیں کہ ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے!!

گھر۔ سطر ۵ صفحہ ۳۱

(۲۰) عورت کا آنچل

یہ عورت جو تلسی کے پودے کی طرح گھمبیر اور مقدس ہو سکتی تھی۔ یہ جو سُرخ گلاب کی طرح کسی آنگن کی پہنائی کو مہکا سکتی تھی۔ یہ عورت جو اپنے آنچل کے سائے میں سو بہاروں کو جنم دے سکتی تھی۔ کیوں اس وقت اپنے سینے سے ایک پتھر کو چمٹائے فرش خاک پر کٹی ہوئی ٹہنی کی طرح پڑی تھی۔

گھر۔ سطر ۱۱، صفحہ ۳۱

جمیل جالبی

محمد صدیق بسرا خوشنویس

